

MIRZA GHALIB MIRZA ASADULLAH BAIG KHAN

دیوانِ غالب



A CLASSICAL URDU
& PERSIAN POET
FROM THE MUGHAL EMPIRE
DURING BRITISH
COLONIAL RULE
1797 - 1869

دیوانِ غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ناشر

ثناء پبلی کیشنز - کراچی

موبائل نمبر: 0300-9231954

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب	دیوانِ غالب
شاعر	مرزا اسد اللہ خاں غالب
بار اول	جون 2009ء
تعداد	گیارہ سو
کمپوزنگ	نثار احمد بلوچ
مارکیٹنگ	عمران میمن

قیمت - 300/- روپے

اسٹاکسٹ

☆ رشید نیوز ایجنسی	فریئر مارکیٹ - کراچی
☆ الرحمن بک پبلس	اردو بازار - کراچی
☆ طاہر سنز	اردو بازار - لاہور
☆ کتاب گھر	کمیٹی چوک - راولپنڈی
☆ کتب خانہ مقبول عام	جھنگ بازار - فیصل آباد
☆ فیصل بک اسٹال	کھارادر - کراچی



بہ مہر نامہ جو بوسہ کل پیام رہا
 ہوا نہ مجھ سے بجز درد، حاصل صیاد
 دل و جگر تہِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
 ٹھکست رنگ کی لائی سحرِ شبِ سنبل
 دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا !
 کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا

نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا، غالب!

خیالِ زلف و رُخِ دوست صبح و شام رہا

فہرست

.....	مرزا اسد اللہ خاں غالب
21.....	نقش، فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
22.....	جُز قیس اور کوئی نہ آیا بڑے کار
23.....	کہتے ہو نہ دیگے ہم دل اگر پڑا پایا
24.....	دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
25.....	شوق، ہر رنگِ رقیبِ سر و ساماں نکلا
26.....	دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نمر تھا
27.....	شمارِ سچے مرغوبِ بیتِ مشکل پسند آیا
28.....	دہر میں، نقشِ وفادہ تسلی نہ ہوا
29.....	ستا یشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
32.....	محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا
33.....	بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
35.....	شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا
36.....	نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
37.....	ایک ایک قطرے کا مجھے دنیا پڑا حساب
38.....	بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
40.....	شبِ شمارِ شوقِ ساقی رُستخیز اندازہ تھا
41.....	دوست، غمخواری میں میری سعی فرما دیں گے کیا
42.....	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
44.....	ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!
45.....	در خورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا

- 47..... پے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
- 48..... گرنہ اندوہِ شبِ فرقتِ بیاں ہو جائے گا
- 50..... دردِ منتِ کشِ دوانہ ہوا
- 51..... گلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگی جا کا
- 52..... قطرہئے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
- 53..... یک ذرّہ زمیں نہیں بیکار باغ کا
- 54..... وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پہاں سمجھا
- 55..... پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا
- 56..... ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!
- 58..... تو دوست کسی کا بھی، سنگر! نہ ہوا تھا
- 59..... شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوتِ ناموس تھا
- 60..... عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
- 61..... رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف!
- 62..... ذکرِ اُس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا
- 63..... غافل بہ وہمِ نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں
- 64..... جوڑ سے باز آئے، پر باز آئیں کیا!
- 65..... عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
- 67..... پھر ہوا وقت کہ ہو بالِ کشا موجِ شراب
- 69..... افسوس کہ دیداں کا کیا رزقِ فلک نے
- 70..... آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
- 71..... غیریوں کرتا ہے میری پُرسش، اُس کے ہجر میں
- 72..... گلشن میں بندوبستِ برنگِ دگر ہے آج
- 73..... نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
- 74..... حُسن، غمزے کی کشاکش سے ٹھٹھا میرے بعد
- 75..... بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظرِ در و دیوار
- 77..... گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر

- 79..... کیوں جل گیا نہ تابِ رُخ یار دیکھ کر
- 81..... لرزتا ہے مراد دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
- 82..... ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
- 84..... صفاے حیرتِ آئینہ ہے سماں زنگِ آخر
- 84..... جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ عریانی
- 85..... لازم تھا کہ دیکھو مرارستا کوئی دن اور
- 89..... نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
- 91..... مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
- 93..... رُخ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع
- 94..... زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
- 96..... آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
- 97..... ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفاے گل
- 99..... غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
- 101..... وہ فراق اور وہ وصال کہاں
- 101..... کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
- 103..... آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
- 105..... عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
- 106..... مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جس وقت
- 107..... ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
- 108..... ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
- 110..... مانعِ دشتِ نور دی، کوئی تدبیر نہیں
- 112..... جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
- 113..... مِلتی ہے خوے یار سے نارِ التہاب میں
- 115..... کل کے لئے، کر آج نہ خستِ شراب میں
- 117..... حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
- 119..... ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں

- 121..... نالہ جزُ حُسنِ طلب اے ستم ایجاد! نہیں
- 124..... یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
- 125..... نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
- 126..... تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
- 127..... دائم پڑا ہوا ترے ڈر پر نہیں ہوں میں
- 128..... سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
- 131..... دیوانگی سے، دوش پہ زُنار بھی نہیں
- 133..... نہیں ہے زخم کوئی، بنجیے کے درخو ر مرے تن میں
- 134..... مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
- 135..... دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے
- 137..... غنچہٴ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ ”یوں“
- 139..... حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
- 140..... وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
- 142..... قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
- 144..... دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو
- 145..... واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو
- 147..... تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
- 148..... گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو!
- 150..... کسی کو دے کے دل کوئی نوا سخ فغاں کیوں ہو!
- 154..... مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
- 155..... بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
- 156..... ہے بزمِ بُناں میں سخن آزر دہ لبوں سے
- 157..... غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
- 159..... کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
- 160..... درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہاے ہاے!
- 162..... سرگشتگی میں، عالم ہستی سے یاس ہے

- 163..... گر خامشی سے فائدہِ اخفا سے حال ہے
- 164..... ایک جا حرفِ وفا لکھتا تھا، سو بھی مٹ گیا
- 165..... مری ہستی، فضاے حیرت آبادِ تمنا ہے
- 166..... چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
- 167..... عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
- 169..... ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
- 170..... اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
- 172..... رفتارِ عمر، قطع رہِ اضطراب ہے
- 173..... دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
- 176..... سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
- 177..... دل سے تری نگاہ، جگر تک اتر گئی
- 179..... تسکین کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
- 180..... کوئی دن، گر زندگانی اور ہے
- 181..... کوئی اُمید بے نہیں آتی
- 182..... دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟
- 183..... کہتے تو ہوتم سب کہ بتِ عالیہ مو آئے
- 185..... پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
- 186..... بچوں تہمت کشِ تسکین نہ ہو، گر شادمانی کی
- 186..... نکوہش ہے سزا، فریادی بیدادِ دلبر کی
- 187..... بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
- 189..... جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
- 189..... ظلمتِ کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
- 191..... آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
- 193..... جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
- 195..... حُسنِ مہر، گر چہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
- 197..... نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

- 198..... عجب نشاط سے جلا د کے چلے ہیں ہم آگے
- 199..... ہلکے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
- 201..... ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو ”تو کیا ہے“؟
- 203..... میں انہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں
- 204..... غیر لیں محفل میں، بو سے جام کے
- 205..... پھر اس انداز سے بہار آئی
- 206..... کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
- 208..... جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رنو کی
- 209..... سیماب، پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم
- 210..... چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
- 212..... ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
- 214..... نکتہ چیں ہے، غم دل اُس کو سُنائے نہ بنے
- 216..... چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ غریانی کرے
- 217..... وہ آ کے، خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے
- 218..... تپش سے میری، وقفِ کش مکش، ہر تارِ بستر ہے
- 220..... ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
- 220..... کرے ہے بادہ ترے لب سے کسپِ رنگِ فروغ
- 221..... کیوں نہ ہو چشمِ بٹاں جو تغافل، کیوں نہ ہو؟
- 221..... دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے
- 223..... دیکھ کر در پردہ گرم دامنِ افشانی مجھے
- 224..... یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
- 255..... حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آمائش ہے
- 227..... کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ
- 228..... زبسکہ مشقِ تماشا جوں علامت ہے
- 229..... لاغراتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
- 230..... باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے

- 232..... کہوں جو حال، تو کہتے ہو، "مُدّعا کہیے"
- 234..... رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
- 236..... عرضِ نازِ خموشی دنداں، برائے خندہ ہے
- 237..... جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
- 239..... ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
- 240..... بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے!
- 241..... باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
- 243..... ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
- 246..... ہجومِ نالہ حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
- 247..... خموشیوں میں، تماشا ادا نکلتی ہے
- 247..... جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے
- 249..... آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
- 250..... شبِ نیم بہ گلِ لالہ، نہ خالی زادا ہے
- 252..... منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی
- 254..... غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
- 255..... مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
- 258..... نویدِ امن ہے بیدار دوست جاں کے لئے
- 260..... منقبت میں
- 262..... مطلعِ ثانی
- 263..... منقبت میں
- 267..... ہاں! نہ نو! سنیں ہم اُس کا نام
- 268..... زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
- 270..... قصیدہ
- 271..... گنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
- 273..... مثنوی در صفِ انبہ
- 275..... قطعات

278.....	درمدحِ ڈلی
280.....	بیانِ مصتف
282.....	مدح
283.....	ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو
284.....	درمدحِ شاہ
286.....	قطعہ
286.....	گزارشِ مصتف بکصورِ شاہ
290.....	رباعیات
296.....	ضمیمہ
298.....	اپنا احوالِ دل زار، کہوں یا نہ کہوں!
299.....	ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
300.....	مجلسِ شمعِ عذراں میں جو آجاتا ہوں
301.....	شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
302.....	میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
303.....	کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
304.....	آپ نے مَسْنِي الضُرُّ، کہا ہے تو سہی
305.....	لطفِ نظارۂ قاتل، دم بسکل آئے
307.....	بہادر شاہ ظفر
311.....	قصیدہ
320.....	مثنوی
321.....	قطعات
324.....	قطعہ تاریخِ اختتامِ کتاب
332.....	فرویات
335.....	نسخہ حمیدیہ



مرزا اسد اللہ خاں غالب

ولادت آگرہ: ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷

وفات دہلی: ۱۵ فروری ۱۸۶۹

مختصر حالاتِ زندگی:

نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطابات، اسد اللہ خاں نام مرزا نوشہ عرف اور غالب تخلص تھا والد کا نام مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ جو سپاہی پیشہ تھے وہ ریاست اودھ، ریاست حیدرآباد اور ریاست الور سے وابستہ رہے مرزا غالب نے ابھی پانچویں برس میں قدم رکھا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب ان کی پرورش ان کے چچا نصر اللہ بیگ کے ذمہ ہوئی جو مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد میں صوبیدار تھے اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے، ڈیڑھ لاکھ روپے کی جاگیر بھی تاحیات عطا ہوئی تھی انہوں نے اس دُرِّ یتیم کو اپنی آغوشِ محبت میں لے کر گھر محبت و الفت بنا رکھے۔ نو برس کی عمر میں شفیق چچا بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ تنخواہ بند اور جاگیر ضبط ہو گئی۔ مرزا انھیال میں آگئے یہاں ان کے نانا خواجہ غلام حسین نے انہیں ہر طرح کی آسائش بہم پہنچائی۔ یہ زمانہ غالب کی بے فکری اور فراغت کا زمانہ تھا۔ تعلیم و تربیت کے لئے مولوی معظم علی، نظیر اکبر آبادی، اور ملا عبدالصمد پاری جیسے اساتذہ موجود تھے۔ ۱۳ برس کی عمر میں ان کی شادی نواب الہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم

سے ہوئی۔ شادی کے بعد دلی چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ اگرچہ اس ذوق کی تکمیل دلی میں ہوئی۔

غالب مالی طور پر ہمیشہ تنگ دست رہے اگرچہ تنگ دستی میں ان کی شاہ خرچی کو بھی بڑا دخل ہے۔ چچا کی پنشن میں سے انہیں بھی حصہ ملا کرتا تھا۔ جو بعض وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا۔ اس کی بحالی کے لئے مرزا نے بہت جتن کئے۔ کلکتہ میں مقدمہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ واپس آتے ہوئے لکھنؤ اور بنارس کی سیر کی نواب نصیر الدین حیدر والی ریاست اودھ کا قصیدہ لکھا۔ پانچ صد روپے سے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا مگر دو سال بعد ریاست کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ مغلیہ دربار سے وابستگی، حتیٰ کہ ذوق کی وفات کے بعد ”استادشہ“ ہو جانے پر بھی انہیں آسودگی حاصل نہ ہوئی۔ نواب رامپور یوسف علی خاں کی طرف سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ کچھ دوست احباب اور شاگرد خبر گیری کرتے تھے افسوس وہ امیر زادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوا۔ جس کی نوعمری کا زمانہ نہایت رئیسانہ، ٹھاٹھ باٹھ سے گذرا، اس کو صرف ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے ساری عمر غریبانہ حال سے بسر کرنا پڑی۔ وہ ”گردشِ مدام“ سے گھبرائے ضرور کہ تقاضائے بشریت ہے۔ مگر انہوں نے گردشِ مدام کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے ان کی طبعی خوش طبعی ان کے آڑے آئی انہوں نے بڑے سے بڑے صدے کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ اور بالآخر اپنے خالق سے جا ملے۔

تصانیف:

- (۱) دیوانِ اردو (۲) کلیاتِ نظم فارسی (۳) کلیاتِ نثر فارسی (۴) عودِ ہندی (اردو خطوط) (۵) اردوئے معلّی (اردو خطوط) (۶) لطائفِ غیبی (علمی مباحثے) (۷) قاطع برہان (مشہور فارسی) لغت ”برہان قاطع“ پر اعتراضات (۸) تیغ تیز (۹) غالب نامہ (دونوں کتابیں قاطع برہان کے ضمن میں ہیں) (۱۰) بیچ آہنگ (فارسی انشاء پروازی اور خطوط)،
- (۱۱) مہرِ نیروز (تاریخ مغلیہ۔ امیر تمپور سے ہمایوں تک) (۱۲) دستنبو (جنگِ آزادی ۱۹۵۷ کے

حالات) (۱۳) سبد چین (فارسی قصائد، قطعات اور خطوط)

غالب کی شاعرانہ عظمت:

غالب دنیائے شاعری کے ان چند درخشندہ ستاروں میں سے ہیں جن کی آب و تاب سے جہانِ شعر منور ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کا انحصار ان کی جدت پسندی اور منفرد لب و لہجہ پر ہے انکے ہاں پیرایہ بیان میں دلفریبی کے علاوہ موضوعات کا بے حد تنوع اور رنگارنگی نظر آتی ہے اسی بنا پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کہتے ہیں۔ ”لوح سے تحت تک بمشکل سو صفحات ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس کی زندگی کے تاروں میں خوابیدہ یا بیدار نہیں۔“ قدرت نے غالب کو وسیع مشاہدہ اور عمیق قوتِ تخیلہ سے نوازا تھا اسی لئے وہ شاعری کی سابقہ روایات سے یکسر روگردانی کر کے زبان و بیان اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک ایسا معیار مقرر کرتے ہیں جو اپنے اندر وسعت بھی رکھتا ہے اور جدت بھی۔ غالب تجربات و واقعات زندگی کو انوکھے اور منفرد زاویے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے اپنی جولانی طبعِ ندرتِ فکر و خیال اور جدتِ ادا کی بدولت اردو شاعری کے قاری کو ایک نئے انداز میں سوچنا اور محسوس کرنا سکھایا اور بقول ڈاکٹر عبدالسلام ”ایک نیا ذہن، نیا شعور، نیا ماحول اور نیا نسب عطا کیا۔“ اسی بنا پر ایک نئے لب و لہجہ کی وجہ سے غالب اپنے روایت پسند دور میں نامقبول ہوا۔ لیکن بعد میں آنے والے دور میں جب فہم و ادراک کا محور وسیع ہوا تو غالب کی شاعری کو صحیح طور پر سمجھا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جو انسانی جذبہ و احساس کو متاثر کرنے کے علاوہ تفکر اور ذہن (Intellect) کو بھی اپیل کرتا ہے اعتبار سے اردو کا کوئی شاعر غالب کی ہمسری نہیں کرتا۔

غالب کی شاعری کا نقادوں نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا دور مشکل پسندی کا ہے۔ جس میں فارسی کے مشکل گو شاعر مرزا عبدالقادر

بیدل کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس دور میں غالب مشکل الفاظ اور تراکیب اور

دورِ ازکار تشبیہات و استعارات لاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خان قیامت ہے

جلد ہی وہ فارسیت اور نازک خیالی کو خیر باد کہہ کر سادہ گوئی کی طرف راغب ہوئے۔ دوسرے دور میں زبان و بیان قدرے صاف ہے۔

تیسرا دور غالب کے کمالِ فن کی آخری منزل ہے جس میں سادگی و پرکاری کا سارا لطف موجود ہے۔

خصوصیاتِ کلام

جدت پسندی:

کلام غالب کی بنیادی خصوصیات جدت پسندی ہے ان کے ہاں جدت ادا، جدت مضامین، جدت تشبیہات و استعارات اور جدت خیال، غرض ہر پہلو سے انوکھا اور نرالا انداز ملتا ہے۔

بقول مولانا حالی: ”جس روش پر دوسرے چل رہے تھے، مرزا نے اس سے الگ ایک نئی روش تلاش کی“

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

جدت ادا:

غالب کی شاعری میں جہاں نئے نئے موضوعات اور مضامین بیان ہوئے ہیں وہاں ان کا طرزِ ادا بھی منفرد ہے وہ معمولی سے معمولی بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ وہ بہت

ہی دلچسپ اور دل نشین بن جاتی ہے۔ طرزِ ادا کی اس خوبی کا خود غالب کو بھی احساس تھا وہ کہتے ہیں۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن در بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

غالب دوسرے شعراء کے بیان کردہ خیالات اور پامال مضامین کو اس حسن و خوبی

سے بیان کرتے ہیں کہ وہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں طرفگہی ادا کی صفت غالب

کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ بقول آل احمد سرور۔

غالب کی شاعرانہ عظمت کا قصران کی جدت طرازی پر تعمیر ہوا ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تیری وفا سے ہو تلافی کہ دہر میں

ترے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ایجاز و اختصار:

غزل میں بات کو ڈھکا چھپا کر کہنا اس کی بنیادی خصوصیت ہے چنانچہ کلام غالب کی

ایک ممتاز صفت ایجاز و اختصار ہے وہ کم سے کم الفاظ میں بڑے بڑے مفاہیم کو یوں ادا کرتے

ہیں کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے ان کے اشعار کا ایک ایک لفظ ”گنجینہ معنی کا

طلسم“ ہے وہ شعر میں ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کرتے ہیں جن سے تہ در تہ معنی کی گرہیں

کھلتی جاتی ہیں۔

قفص میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہدم

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

مضمون آفرینی:

غالب کے نزدیک شاعری محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ مضمون آفرینی ہے۔ وہ اشعار میں عجیب و غریب اور خیال افروز نکتے اور باریکیاں بیان کرتے جاتے ہیں غالب کا باریک بین ذہن معمولی بات کے ایسے پہلو پر جا پہنچتا ہے جس تک دوسروں کی رسائی تقریباً ناممکن ہے۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شوخی اور ظرافت:

غالب ایک شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ اور بقول حالی نکتہ داں، نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے۔ ان کی ذاتی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار تھی پھر ان کا دور بھی مصائب اور ابتلاء کا دور تھا۔ لیکن غالب مزاج کے اعتبار سے انسانوں کی اس صف میں تھے جو غم میں مسکراتے ہیں۔ چنانچہ داخلی اور خارجی اعتبار سے مایوسی کے باوجود غالب کو جس چیز نے زندہ رکھا وہ ان کے مزاج کی زندہ دلی اور ہمہ گیری ہے۔ یہی زندہ دلی ان کی زندگی کی طرح شاعری اور خطوط میں بھی نہایت شگفتہ اور تروتازہ پھول کھلاتی ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پہلوداری:

مفسرانی عالم

غالب کی شاعری ایک اور نمایاں خوبی پہلوداری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اکثر اوقات دو دو مفاہیم پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بظاہر ایک معنی ادا کرتے ہیں لیکن ذرا غور کرنے پر ایک اور معنی ذہن میں آتے ہیں جو نہایت پر لطف کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ بقول خلیل الرحمن اعظمی ”غالب کے اشعار ایک تراشے ہوئے نگینے کی مانند ہیں جو ہر پہلو سے ایک نیا انداز دکھاتا ہے“

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا
دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افکن عشق
ہے مقرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

فلسفہ و حکمت:

غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں فلسفیانہ رموز اور حکیمانہ افکار بیان ہوئے ہیں ان سے قبل تصوف کے موضوعات عام تھے لیکن فلسفہ اور حکمت کے موضوعات ناپید تھے اگرچہ غالب باقاعدہ فلسفی نہیں تھے لیکن اپنے اشعار میں انہوں نے بعض اوقات ایسے ایسے رموز بیان کئے کہ وہ فلسفہ کی ضخیم کتابوں پر بھی بھاری ہیں غالب کا طرز استدلال فلسفیانہ ہے وہ حقائق کو فلسفیانہ نظر سے جانچنے کے عادی تھے جس سے بات میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو چیز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غمِ اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انسانی نفسیات کی عکاسی:

غالب انسانی فطرت اور نفسیات کے گہرے رمز آشنا تھے۔ وہ زندگی اور اس کے مسائل کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتے تھے انہوں نے انسانی مزاج کی بوقلمونیوں کو زبانِ شعر میں بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں انسانی نفسیات، انسانی مزاج اور انسانی مسائل و حقائق کی گہری آگاہی نظر آتی ہے۔

رنج سے خوگر ہو انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا
کہ ہوگا باعث افزائش سوزِ دروں وہ بھی
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

روایت شکنی:

غالب طبعاً ایک جدت طراز اور روایت شکن انسان تھے ان کی زندگی، شاعری، اور خطوط اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ ہر معاملے میں اپنی منفرد رائے رکھتے تھے۔ غالب کے مزاج میں خود پسندی حد درجہ تھی ان کے نظریات و تصورات اور سوچنے کے انداز میں بھی انفرادیت پائی جاتی ہے چنانچہ وہ بعض اوقات مروجہ عقائد و نظریات سے روگردانی کرتے ہیں اور روایتی خیالات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ ایسے تصورات جنہیں تقدس کا درجہ حاصل ہے ان پر طنز اور چوٹ کرتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اپنی ذات کو بھی نہیں بخشتے اور خدا تک سے بھی شوخی کر جاتے ہیں۔ محبوب، شیخ، زاہد، جنت و دوزخ، خضر، واعظ، حوریں، غرض کوئی بھی ان کے

نشرِ تنقید سے نہیں بچ سکا یہ سب ان کے مزاج کی جدت طرازی اور انفرادیت پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی

بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

چاہتے ہیں خو بُرد یوں کو اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

پکڑتے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق

آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

کیا کیا خضر نے سکندر سے!

اب کے رہنا کرے کوئی!

ایسی جنات کا کیا کرے کوئی!

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

والسلام: ادارہ





نقش، فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوے شیر کا

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالب! اسیری میں بھی آتش زیر پا
مُوے آتش دیدہ، ہے حلقہ مری زنجیر کا



جراحتِ تحفہ، الماس اُرمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مُبارک باد، اسد! غمخوارِ جان، درد مند آیا



جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار
صحرا مگر بہ تنگی چشمِ حسود تھا

آشفگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیالِ نو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں ملکِ غمِ دل میں سبقِ ہنوز
لیکن یہی کہ ”رفت“ گیا اور ”بود“ تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں تنگِ وجود تھا

تیٹھے بغیر ہر نہ سکا کوہکن، اسد!
سرکشہٴ خمارِ رسوم و قیود تھا



کہتے ہو نہ دینگے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے، ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیت کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا

غُنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟



دل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگِ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل! بارہا
میرا آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا



شوق، ہر رنگِ رقیبِ سروِ ساماں نکلا
قیسِ تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب!
تیر بھی سینہ بسمل سے پر افشاں نکلا

بُوے گل، نالہٴ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرتِ زودہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کامِ یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نو آموزِ فنا، ہمتِ دُشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریے نے اک شورا اٹھایا غالب!
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا



دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
 عشقِ نبردِ پیشہ طلبگارِ مرد تھا
 تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
 اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگِ زرد تھا
 تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
 مجموعہٴ خیال ابھی فردِ فرد تھا
 دل تا جگر کہ ساحلِ دریاے خوں ہے اب
 اس رہگزر میں جلوہٴ گل، آگے گرد تھا
 جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی
 دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا
 احبابِ چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
 زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نورد تھا
 یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
 حقِ مغفرت کرے! عجب آزادِ مرد تھا



شمارِ سنجہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشاے یہ یک کفِ بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلیِ نومیدیِ جاویدِ آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدہٴ مشکل پسند آیا

ہو اے سیرِ گلِ آئینہٴ نیمہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا



دہر میں، نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سبزہ خط سے ترا کاکلِ سرکش، نہ دبا
یہ زمرد بھی، حریفِ دمِ انعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزر گاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفسِ جادہ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوشِ منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمہ یک جنبشِ لب سے، غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا



ستایشگر ہے زاہدِ اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجئے، بیداؤ کاوشہیائے مرگاں کا
کہ ہر یک قطرہٴ خونِ دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع، میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیتاں کا

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پر تو خُر شید عالمِ شبِ نیمستاں کا

مری تعمیر میں، مضمحل ہے اک صورتِ خرابی کی
ہیولی برقِ خرمن کا، ہے خونِ گرم دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدارِ اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

ہندزاک پر تو نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ، گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سب کیا، خواب میں آ کر تبسم ہاے پنہاں کا

نہیں معلوم، کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مڑگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا، غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا



نہ ہو گا، یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
 حبابِ موجہٴ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بید ماغی ہے
 کہ موجِ بُوے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا



سراپا رہن عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی
 عبادتِ برق کی کرتا ہوں، اور افسوسِ حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
 جو تو دریاے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا



محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہاے ناز کا

تو، اور سوے غیر نظر ہاے تیز تیز!
میں، اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا!

صرف ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سرشیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اُس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدا!
سینہ، کہ تھا دینہ، گہر ہاے راز کا



بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر گھلا
رکھیو یارب! یہ درِ گنجینہ گوہر گھلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اکِ دَر ہے میری گور کے اندر کھلا

مُنہ نہ گھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم؟ ہے بلاؤں کا نُزول
آج ادھر ہی کو رہیگا دیدہ اختر کھلا؟

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے، وطن سے، نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے، غالب! گنبد بے در کھلا



شب کہ برقی سوزِ دل سے زہرہ ابر آب تھا
شعلہٴ جوالہ، ہر یک حلقہٴ گرداب تھا

واں کرم کو، عذریہ بارش تھا عنانگیرِ خرام
گریے سے یاں پنبہٴ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبخو
یاں رواں مرگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوارِ جو
واں وہ فرقی ناز، محوِ بالشِ کخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تاعرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونا بہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا



نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیرِ گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے!
خانہ عاشق مگر سازِ صداے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی، کیا کہوں
پہلوے اندیشہ، وقفِ بشرِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے بخونِ نارِ سانے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

ق

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدہ بیخواب تھا

میں نے روکا راتِ غالب کو، وگر نہ دیکھتے
اُس کے سیلِ گر یہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا



ایک ایک قطرے کا مجھے دنیا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مرگانِ یار تھا

اب میں ہوں، اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تونے آئینہ، تمثالِ دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھر وہ کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

موجِ سراپِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغِ آبدار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر آب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا



بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیتر نہیں انساں ہونا

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگی شوق، کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضاے نگہ کرتا ہے
جو آئینہ بھی چاہے ہے مرگاں ہونا

عشرتِ قتلگہرِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمناے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگِ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زودِ پشیمان کا پشیمان ہونا!

حیف، اُس چارِ گرہ کپڑے کی قسمتِ غالب!
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا



شبِ نُماری شوقِ ساقی رُستخیز اندازہ تھا
تاجِ بادہ، صورتِ خانہ خمیازہ تھا

یک قدمِ وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہٴ اجزائے دو عالمِ دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشتِ خرامی ہاے لیلیٰ کون ہے
خانہٴ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حُسن
دستِ مرہونِ جتا، رخسارِ رہنِ غازہ تھا

نالہٴ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادِ گارِ نالہٴ یکِ دیوانِ بے شیرازہ تھا



دوست، غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور! کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا؟

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرسِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؟

گر کیا ناصح نے ہم کو قیدِ اچھا، یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا!

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفتِ اسدا!
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھاویں گے کیا؟



یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پہ جیسے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری ناڑ کی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بُو دا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

آہا کھنپا تیر

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوستِ ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی عمکسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ، پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگر چہ جاں گسل ہے، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جوڑ سوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیانِ غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا



ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا!
 تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
 نوازش ہاے بیجا دیکھتا ہوں
 نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
 فروغِ شعلہٴ خس، یک نفس ہے
 نفس، موجِ محیطِ بیخودی ہے
 دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
 دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
 محابا کیا ہے میں ضامنِ ادھر دیکھ
 سن اے غارتگرِ جنسِ وفا! سن
 کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟
 یہ، قاتل، وعدہٴ صبر آزما کیوں؟
 نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!
 کہاں تک اے سراپا ناز کیا، کیا
 شکایت ہاے رنگیں کا گلا کیا!
 تغافل ہاے تمکین آزما کیا!
 ہوس کو پاس ناموسِ وفا کیا!
 تغافل ہاے ساقی کا گلا کیا
 غمِ آوارگی ہاے صبا کیا
 ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
 شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!
 شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
 شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
 یہ، کافر، فتنہٴ طاقت رُبا کیا!

بلاے جاں ہے غالبِ اُس کی ہر بات

عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا



در خورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود ہیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
زور و کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامی چشمِ خوباں
تیرا پیار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے، جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بنِ موسے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
 حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں گل!
 کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پُزے
 دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہوا



آسدا! ہم وہ جوں جولاں گداے بے سرو پا ہیں
 کہ سے سرِ پنجہ مرگانِ آہو، پشت خار اپنا



پے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
 بخوں غلتیدہ صد رنگِ دعویٰ پارسائی کا
 نہ ہو حسنِ تماشا دوستِ رسوا بیوفائی کا
 بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
 زکاتِ حسن دے اے جلوہٴ بینش! کہ مہرِ آسا
 چراغِ خانہٴ درویش ہو، کاسہ گدائی کا
 نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر
 رہا ماتدِ خونِ بے گنہ، حقِ آشنائی کا
 حتمائے زباں مجھ سپاسِ بے زبانی ہے
 مٹا جس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا
 وہی اک بات ہے جو یاں نفسِ واں نکہتِ گل ہے
 چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
 دہانِ ہر بیتِ پیغامہ جو زنجیرِ رسوائی
 عدم تک بیوفا! چرچا ہے تیری بیوفائی کا
 نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب! مختصر لکھ دے
 کہ حسرتِ سنج ہوں، عرضِ ستم ہاے جدائی کا



گر نہ اندوہِ شبِ فرقتِ بیاں ہو جائے گا
بے تکلفِ داغِ مہ، مُرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر بن ہوتا ہے آب
پر تو مہتاب، سلیِ خانمں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہِ خس میں، جیسے خوںِ رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر، ایک چشمِ خوںِ فشاں ہو جائے گا

واے! گر میرا ترا انصافِ محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسد!
دوستیِ ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا



درد منت کشِ دوا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
ہم کہاں قسمت آزماتے جائیں
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے؟

میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کام گر رُک گیا، روانہ ہوا
لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے، کہ لوگ کہتے ہیں

”آج غالب غزل سرا نہ ہوا“



گلہ ہے، شوق کو، دل میں بھی تنگی جا کا
گمہ میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو، اور پانچ مکتوب!
مگر ستمزدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیشِ دنیا کا

غمِ فراق میں، تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ہنوز محرمی حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو، کامِ چشمِ بینا کا

دل اُس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا!

نہ کہہ کہ گریہ بہ مقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یادِ اسدا!
جفا میں اُس کی ہے اندازِ کار فرما کا



قطرہٴ مے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے، سرا سر رشتہٴ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر یک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟



یک ذرّہ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے نئے، کے ہے طاقت آشوبِ آگہی
کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایام کا

بلبل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشہٴ فکرِ سخن مجھے
تیرا کی قدیم ہوں دُورِ چراغ کا

سوار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہِ غبار
یہ میکدہ خراب ہے نئے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
اب بہار، ٹمکدہ کس کے دماغ کا!



وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
 رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنوان سمجھا
 یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
 چاک کرتا ہوں، میں جب سے کہ گریباں سمجھا
 شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
 اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
 بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
 رُخ پہ ہر قطرہ عرقِ دیدہ حیراں سمجھا
 عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
 نبضِ کس سے تپشِ شعلہ سوزاں سمجھا
 سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحتِ طلبی
 ہر قدم سایے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
 تھا گریزاں مژدہ یار سے دلِ تادمِ مرگ
 دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
 دل دیا جان کے کیوں اُس کو وفادار اسدا!
 غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا



پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل جگر تثنہ فریاد آیا
 دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
 سادگی ہاے تمنا، یعنی پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
 عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل! نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
 زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہگزر یاد آیا
 کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
 آہ وہ جراتِ فریاد کہاں دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
 پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
 کوئی ویرانی سی ویرانی ہے! دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

میں نے مجنون پہ لڑکپن میں اسدا!

سنگ اٹھایا تھا، کہ سر یاد آیا



ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!
آپ آتے تھے مگر کوئی عنایاں گیر بھی تھا!

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اُس میں کچھ شائبہِ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نچیر بھی تھا؟

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باری زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا!
بات کرتے، کہ میں لبِ تشنہِ تقریر بھی تھا

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر کوئی
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا
نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفۃ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا!

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

رمختے کے تمہیں استاد نہیں ہو، غالب!
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا



لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا زیارت کدہ ہوں دل آزر دگاں کا
ہمہ نا امیدئی ہمہ بدگمانی میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا



تو دوست کسی کا بھی، شکر! نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخب کی طرح دستِ قضا نے
خُشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیقِ باندازہ ہمت، ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قَدِ یار کا عالم
میں مُعْتَدِ فتنہِ محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل آزر دگی یار سے خوش ہوں
یعنی سبقِ شوقِ مکرر نہ ہوا تھا

دریاے معاصی تنگِ آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی، اسدا! داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا



شب کہ وہ مجلسِ فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتہ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے جنا
کس قدر، یارب! ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

حاصلِ الفت نہ دیکھا، جُز شکستِ آرزو
دل بہ دل پیوستہ، گویا یک لبِ افسوس تھا

کیا کہوں، بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منت کیموس تھا



آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا!
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا



عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
 جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
 جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے
 ہوں شمعِ کُشتہ، درِ خورِ محفل نہیں رہا
 مرنے کی، اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ میں
 شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
 بر رُوے ششِ جہت درِ آئینہ باز ہے
 یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
 وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
 غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
 گو میں رہا رہنِ ستمہائے روزگار
 لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
 دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
 حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
 بیدارِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدا!
 جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا



رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف!
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا!

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانہ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلای آشنا

شوق ہے ساماں ترا زنا زشِ اربابِ عجز
ذرہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانوِ مونس اور آئینہ تیرا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمشالِ شیریں تھا! اسد!
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا



ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
 بن گیا رقیبِ آخر، تھا جو رازداں اپنا
 مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں، یارب!
 آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
 منظرِ اک بلندی پر اور، ہم بنا سکتے
 عرش سے ادھر ہوتا، کاشکے مکاں اپنا!
 دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالینگے
 بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں اپنا
 دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں اُن کو دکھلا دوں
 انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
 گھتے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
 تنگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
 تا کرے نہ غمنازی، کر لیا ہے دشمن کو
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
 ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
 بے سبب ہوا، غالب! دشمن آسماں اپنا



سُرمہٗ مُفیتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
 کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساسِ میرا
 رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم!
 تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا



غافل، بہ وہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
 بے شانہٗ صبا نہیں طرہ گیاه کا
 بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ
 صیدِ زدام جتہ ہے اس دامگاہ کا
 رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
 شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
 مقتلِ کوس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
 پُر گُلِ خیالِ زخم سے دامنِ نگاہ کا
 جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے، اسد!
 پروانہ ہے وکیلِ ترے داد خواہ کا



جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا!
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!

رات دن گردش میں ہیں، سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا!

ہو لئے کیوں نامہ، کے ساتھ ساتھ
یا رب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا!

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا!

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ
رگئے پر، دیکھئے دکھلائیں کیا!

پوچھتے ہیں وہ کہ، غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!



لطافت بے کثافت، جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
 چمن، زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا
 حریفِ جوششِ دریا، نہیں خودداری ساحل
 جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا



عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
 درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے، قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
 تھا لکھا، بات کے بنتے ہی، جدا ہو جانا

دل ہوا کش مکشِ چارہ زحمت میں تمام
 مٹ گیا گھسنے میں اس عقدے کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ!
 اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دل سے مٹنا تری انکشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے، ابر بہاری کا برس کر گھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گلِ ذوقِ تماشا غالب!
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تاکہ تجھ پر گھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ب

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب
دے بٹ مے کو دل و دستِ سُنا، موجِ شراب

پوچھ مت وجہ یہ مستی اربابِ چمن
سایہ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقہ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے، اگر
موجِ ہستی کو کرے، فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تہنہ ناز
دے ہے تسکین بہ دم آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپر رنگ سے ہے بال کُشا موجِ شراب

موجہٴ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال
ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

نشے کے پردے میں ہے محو تماشا سے دماغ
بسکہ رکھتی ہے سر نشوونما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیت فصل
موجہٴ سبزہٴ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرح ہنگامہ ہستی ہے زہے موسمِ گل!
رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب!

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہٴ گل دیکھ اسدا!
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب

ت

افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے
 جن لوگوں کی تھی در خورِ عقدِ گہرا انگشت
 کافی ہے نشانی تری، چھلے کا نہ دینا
 خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
 لکھتا ہوں، اسد! سوزشِ دل سے سخن گرم
 تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت



رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
 جگر کو مرے عشقِ خونا بہ مشرب
 علی الزعمِ دشمنِ شہیدِ وفا ہوں
 پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت!
 لکھے ہے خداوندِ نعمت! سلامت
 مبارک مبارک سلامت سلامت
 نہیں گر سرو برگِ ادراک معنی
 تماشاے نیرنگِ صورت، سلامت



مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، غالب!
یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت



آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دُودِ شمعِ کُشتہ تھا، شاید خطِ رُخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازی حیرت تماشا کیجئے
صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتہ رفتارِ دوست

عشق میں، بیدارِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کُشتہ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ماروِشن، کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

ق

غیر یوں کرتا ہے میری پُرسش، اُس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی عنخوارِ دوست

تا کہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدہ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہِ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے، اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہاے دشمن کی شکایت کیجئے
یا بیاں کیجئے پاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے رریفِ شعر میں، غالب! زبس تکرارِ دوست

ج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق، حلقہٴ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارہٴ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمنہٴ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ در پئے دیوار و در ہے آج



لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں
لہجھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

بج

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمی سعی تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

تجھے بہانہِ راحت ہے انتظارِ اے دل
کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرتِ نظارۂ زگس
بہ کوریِ دل و چشمِ رقیبِ ساغر کھینچ

بہ نیمِ غمزہ ادا کر حق و دلیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پہاں
بروے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

و

حُسن، غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
 بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
 منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
 ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
 شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
 شعلہٴ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
 خوں ہے دل خاک میں احوالِ بٹاں پر، یعنی
 اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
 در خورِ عرض نہیں جوہرِ بے داد کو جا
 نگہِ ناز ہے سُرے سے خفا میرے بعد
 ہے بچوں اہلِ بچوں کے لئے آغوشِ وداع
 چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
 کون ہوتا ہے حریفِ مے مردِ فلکِ عشق
 ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
 غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
 آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب!
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

د

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار

و فورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدمِ پیشتر در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانی سے جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سُرِ سوداے انتظارِ تو آ
کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

نجومِ گرہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایے میں تو سایے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودی عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہ کسی سے کہ غالب، نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار



گھر، جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر
جائے گا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
”جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر، کہے بغیر“

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ”ستم گر“ کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگر نہ ہم
سرجائے یار ہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے، دشمن و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات
سُننا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر



کیوں جل گیا نہ تابِ رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہاے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروے عشق، جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں، تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ، خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مئے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

پک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زُتار باندھ، سُحّہ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راد کو پرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

بگرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدحِ خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر



لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
 میں ہوں وہ قطرۂ شبِ نیم کہ ہوخارِ بیاباں پر
 نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
 سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
 فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے
 کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
 فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
 بہم گر صلح کرتے پارہ ہاے دل نمکداں پر
 نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
 کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہرِ عنوان پر
 مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفقِ آلودہ، یاد آیا
 کہ فرقت میں تری، آتشِ برستی تھی گلستاں پر
 بجز پروازِ شوقِ ناز، کیا باقی رہا ہو گا!
 قیامت اک ہوائے مُند ہے خاکِ شہیداں پر
 نہ لڑنا صح سے غالب کیا ہوا گر اُس نے ہدایت کی
 ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر



ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر، مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُنھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سب گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونا بہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند کہ سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ”ہاں اور“

لوگوں کو ہے ٹھسیدِ جہانتاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چھین
کرتا، جو نہ مرتا کوئی دن، آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور



صفائے حیرتِ آئینہ ہے سماںِ زنگِ آخر
 تغیر، آبِ برجاماندہ کا پاتا ہے رنگِ آخر
 نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر و حشت کی
 ہوا جامِ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگِ آخر



جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہونہ غریبانی
 گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
 برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
 ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
 فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
 متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
 ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
 شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
 فنا کو سوئپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
 فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوفِ گلشن پر
 اسدِ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
 کہ ”مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر“



ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خواہاں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر



لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہوکل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں، اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مَرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے دادوستد کے!
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ ”کیوں جیتے ہیں“ غالب!
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ز

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانندِ صبح و مہر
 ہے داغِ عشقِ زینتِ جیبِ کفنِ ہنوز
 ہے نازِ مفلساں زہِ از دست رفتہ پر
 ہوں گلِ فروشِ شوخیِ داغِ گہنِ ہنوز
 میخانہِ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
 خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیداد فنِ ہنوز



حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
 دعا قبول ہو یا رب! کہ عمرِ خضر و راز
 نہ ہو بہ ہر زہِ بیاباں نورد و ہم وجود
 ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز



وصال جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں
 کہ دیجے آئینہ انتظار کو پرداز
 ہر ایک ذرّہ عاشق ہے آفتاب پرست
 گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہ ناز
 نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں، غالب!
 جہاں یہ کاسہ گردوں ہے ایک خاک انداز



وسعتِ سعی کرم دیکھ کہ سر تا سر خاک
 گزرے ہے آبلہ پا ابر گہر بار ہنوز
 یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحہ دشت
 نقشِ پا میں ہے تپ گرمی رفتار ہنوز



کیوں کر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز
 کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز!
 دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے
 ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
 تاب لائے ہی ہنگی غالب!
 واقعہ سخت ہے اور جان عزیز



نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
 میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو، اور آرایشِ خم کا کل
 میں، اور اندیشہ ہائے دور دراز

لافِ تمکین: فریبِ سادہ دلی
 ہم ہیں، اور راز ہائے سینہ گداز

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرہِ خون
جس سے مرگاں ہوئی نہ ہو گلاباز

اے ترا غمزہ، یک قلم انگیز
اے ترا ظلم، سر بسر انداز

تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو
ریزشِ سجدہٗ جبینِ نیاز

مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا
میں غریب اور تو غریب نواز

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغ، وہ رند شاہد باز!

س

مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تھنہ آزار، تسلی نہ ہوا
بُوے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا، جو زباں کے بدلے
دُشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشہ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سرِ غالبِ وحشی ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

ش

نہ لیوئے، گر خس جوہر طراوت سبزہ خط سے
لگائے خانہ آئینہ میں رُوے نگار آتش

فروعِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکل عاشق
نہ نکلے شمع کے پاسے، نکالے گر نہ خار آتش

ع

جادو رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخِ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع



زُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانی شمع
ہوئی ہے آتشِ گلِ آبِ زندگانی شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگِ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام
بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہِ خوبی شمع

غمِ اُس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلے!
جرے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانی شمع

ترے خیال سے روحِ اہتراز کرتی ہے
بہ جلوہ ریزی باد و بہ پرفشانی شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانہ شمع

جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانی شمع

ف

بیمِ رقیب سے نہیں و داغِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیارِ حیف!

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتماہی نفسِ شعلہ بار حیف!

ک

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالہ بلبیل کا درد اور خندہ گُل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجہ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ!
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جانمک ✓

چھوڑ کر جانا تین مجروحِ عاشق حیف ہے ✓
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گائے تو فیر درد
زخم، مثلِ خندہ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالب! تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرنا، تو میں پلکوں سے چُختا تھا نمک ✓



آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب، اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پر تو خور سے ہے شبینم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل!
گرمی بزم ہے اک رقصِ شرر ہوتے تک

غمِ ہستی کا اسد! کس سے ہو جو مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یکِ دلِ بے مُدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مُجھ سے مرے گنہ کا حساب، اے خدا نہ مانگ

ل

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفاے گل
بلبل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہاے گل

آزادی نسیمِ مُبارک کہ ہر طرف
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دامِ ہواے گل

جو تھا، سوموِجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا
اے وائے نالہٴ لبِ خونیں نواے گل!

خوش حال اس حریف یہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو مثلِ سایہِ گل، سر بہ پائے گل

ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار
میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
میناے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب! مجھے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورقِ گردانی نیرنگِ یک بُتخانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغان، شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائمِ الحسبِ اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں؛ اسد!
جاننے ہیں سینہ پر خوں کو زنداں خانہ ہم



بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانہ زنجیرِ جزو صدا معلوم



مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدانے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کبھی میں ہیں اے خدا!
رکھ لچو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم



لوں دامِ بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوشِ ولے
غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں



وہ فراق اور وہ وصال کہاں
 فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
 دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
 تھی وہ اک شخص کے تصور سے
 ایسا آساں نہیں، لہو رونا
 ہم سے چھوٹا قمار خانہ عشق
 فکر دنیا میں سر گھپاتا ہوں
 وہ مضحک ہو گئے قوی، غالب!
 وہ عناصر میں اعتدال کہاں



کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
 ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
 آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
 کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصتِ غش ہے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں؟

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

پاے افکار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگِ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھئے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفته نوا، کہتے ہیں



آبرو کیا خاک اُس گل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں تنگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گزیہ! کچھ باقی مرے تن میں ہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذڑے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

روقتِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برقِ خرمن میں نہیں

زخمِ سلوانے سے، مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذتِ زخمِ سوزن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ، اک ہیولیٰ ہے، نئے نئے ناسور کا
خون بھی، ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزمِ آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود!
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا، غالب! کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف، ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں



عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا
گر ایک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں

حلقے ہیں، چشمِ ہائے گشادہ بسوے دل
ہر تارِ زلف کو، نگہِ سرمہ سا کہوں

میں، اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو، اور ایک وہ نشیدین کہ کیا کہوں

ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے، خدا نکر وہ، تجھے بیوفا کہوں!



مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنہ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو سمگر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں



ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑینگے، رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

عزّہ اوجِ بناے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں،
رنگِ لاوگی ہماری فاقہِ مستی ایک دن

نغمہ ہاے غم کو بھی، اے دل! غنیمت جانے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب! پیشِ دستی ایک دن



ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے، وگر نہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستمِ عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیجئے، دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ق

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ہر چند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں، مُطربِ ترانہ "هَلْ مِنْ مَزِيدٍ" ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمہ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں مٹھری چھو، موہ گر خونچکاں نہیں

ہے تگِ سینہ دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آزر فشاں نہیں

نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو، کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں!
گویا جبیں پہ سجدہٴ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہاے بوسہ، ولے کیوں کہے، ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں



مانعِ دشتِ نوردی، کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے، مرے پانو میں زنجیر نہیں

شوقِ اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ، غیر از نگہِ دیدہ تصویر نہیں

حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے
جادہِ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدی جاوید! گوارا رہو!
خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر گھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ بہ اندازہ تقریر نہیں

جب کرمِ رنصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجالتِ تقصیر نہیں

غالب! اپنا یہ عقیدہ ہے، بقولِ ناسخ
”آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں“

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سوید اے دل چشم میں آہیں

برشکالِ گریہِ عاشق ہے، دیکھا چاہئے
کھل گئی مانندِ گلِ سو جا سے دیوارِ چمن
الفِ گل سے غلط ہے دعویٰ وارستگی
سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

عشقِ تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنتِ دستِ بدست آئی ہے جامِ نئے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پر تو خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مرجانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے غمِ محرومی جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں



جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

دلِ آشفٹگاں، خالی گنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اکِ قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سُراغِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شبِ روکا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس، غالب!
تماشاے اہلِ کرم دیکھتے ہیں



ملتی ہے خوے یار سے نارُ التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب، اُن کی بزم میں، آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکر وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں، خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے، کس پیچ و تاب میں

میں، اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے
جال نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے!
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے!
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب! چھٹی شراب، پر اب بھی، کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں



کل کے لئے، کر آج نہ نِحتِ شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل، کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے زخسِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں تیج و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم ایک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو بگے ہیں خواب میں

عالم! ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بو تراب میں



حیراں ہوں دل کو رووں کہ بیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں لوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے کھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے ربگزر کو میں

ہے کیا جو گس کے باندھے، میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے سنگ و نام ہے
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں؟

پھر بخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو میں

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گنہر کو میں



ذکر میرا، بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدہ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق!
مژدہ قتلِ مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تک ظرفی منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی! کہ وہ طاقت نہ رہی
حق پر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ”ہم حور نہیں“

ظلم کو ظلم، اگر لطف درنخ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کش پچانہ جم ہیں ہم لوگ
وہ! وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائیِ غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ ”مشہور نہیں“



نالہ جز حُسنِ طلبِ اے ستمِ ایجاد! نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوہِ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرتگہِ خسرو، کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادثِ مکتب
لطمہٗ موجِ کم از سیلیِ اُستاد نہیں

وای! محرومی تسلیم و بدا! حالِ وفا
جاننا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گلِ ولالہ، پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہزیرِ باد نہیں

سبِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ، اے مرغ! کہ گلزار میں صیاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات ترا و ش، گویا
دی ہی جاے دہن اس کو دم ایجاڈ نہیں

کم نہیں، جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب!
تم کو بے مہری یارانِ وطن یاد نہیں!



دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے
تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں!

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہلِ بزم!
ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں!



ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں



قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعب سے وہ بولا، ”یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!“
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے، غالب!
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں



دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
 بارے، اپنی بیکیسی کی ہم نے پائی دادیاں
 ہیں زوالِ آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
 مہر گردوں ہے، چراغِ رہ گزارِ بادیاں



یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
 کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے!
 کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں، اُس کے دست و بازو کو
 یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں!

ترے جواہرِ طرفِ گلہ کو کیا دیکھیں!
 ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں



نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرجبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ ”آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں!“

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچہ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب!
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ ”یاد نہیں“



تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
 آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے!
 تیری فرصت کے مقابل اے عمر!
 قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
 نشہِ رنگ سے ہے واشدِ گل
 غلطی ہائے مضامین مت پوچھ
 اہلِ تدبیر کی واماندگیاں!
 ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
 ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
 برق کو پا بہ جتا باندھتے ہیں
 اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں
 مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
 لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
 آبلوں پر بھی جتا باندھتے ہیں
 سادہ پرکار ہیں خوباںِ غالب!
 ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں



زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
 وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں



دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
 خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
 کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
 انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
 یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے؟
 لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
 حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
 آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
 کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
 لعل و زُمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
 رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ!
 رُتے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
 کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے!
 کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
 غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا
 وہ دن گئے جو کہتے تھے، ”نو کر نہیں ہوں میں“



سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بناتِ التعمش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

قید میں، یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پرزنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کعباں ہو گئیں

بھوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پر یزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی، حوریں، اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مڑگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں، بخیر چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب!
یاد تھیں جتنی دُعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انسان، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب، تو اے اہلِ جہاں!
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں



دیوانگی سے، دوش پہ زُتار بھی نہیں
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آسان تو سہل ہے
دُشوار تو یہی ہے کہ دُشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقتِ بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر و بالِ دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیارِ یک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہاے زار سے میرے خدا کو مان
آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مرگاں سے رُوکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اسِ سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں



نہیں ہے زخم کوئی، بجیے کے درخور مرے تن میں
 ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں
 ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
 کفِ سیلابِ باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
 ودیعت خانہ بیدارِ کاوش ہاے مرگاں ہوں
 نگین نامِ شاہد ہے مرے ہر قطرہ خوں، تن میں
 بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
 شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
 نکوہش، مانعِ بے ربطی شورِ جنوں آئی
 ہوا ہے خندہ احباب، بجیے جیب و دامن میں
 ہوئے اُس مہروش کے جلوہ تماشال کے آگے
 پر افشاں جوہر آئینے میں، مثلِ ذرہ روزن میں
 نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
 جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
 ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
 یہ ہو کر سویدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں تن میں
 اسد! زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خواباں ہوں
 خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے، طوقِ گردن میں



مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر ہو اڑالے جائے
وگر نہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشتِ شمال کی آمد آمد ہے!
کہ غیرِ جلوۂ گل رہگزر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شرانجانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد!
گھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں



دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں!

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں!

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوزِ پردے میں منہ چھپائے کیوں!

دشنہِ عمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخِ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں!

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوش کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں!

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بٹائے کیوں!

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں!

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں!
روئے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں!



عُغْنِچَ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ ”یوں“
 بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ ”یوں“

”پرش طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
 اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ ”یوں“

رات کے وقت مے پے، ساتھ رقیب کو لئے
 آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے
 سامنے آن بیٹھنا، اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُس کے رُوبرُو، کیوں نہ خموش بیٹھے
اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ ”بزمِ ناز چاہیے غیر سے، تہی“
سُن کے، ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ ”یوں“؟

مجھ سے کہا جو یار نے، ”جاتے ہیں ہوش کس طرح؟“
دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ ”یوں“

کب مجھے گُوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر جڑے دل میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ ”یوں“

جو یہ کہے کہ ”ریختہ کیوں کے ہو رشکِ فارسی؟“
گفتہٴ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ ”یوں“

و

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرم تماشا ہو
 کہ چشمِ تنگ، شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو
 بقدرِ حسرتِ دل، چاہیے ذوقِ معاصی بھی
 بھروں یک گوشہ دامن، گر آبِ مہفت دریا ہو
 اگر وہ سر و قد، گرم خرامِ ناز آ جاوے
 کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

○

کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
 بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو!
 طاعت میں، تار ہے نہ مے و انگبیس کی لاگ
 دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
 ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
 ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلمِ سرنوشت کو
 غالب! کچھ اپنی سعی سے کہنا نہیں مجھے
 خرمنِ جلے، اگر نہ مَلخِ کھائے کشت کو



وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارہ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محسّر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامہ زبونی ہمت، ہے انفعال
حاصل نہ کیجئے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارنگی بہانہ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

بٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدا!
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!



قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو، اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں، مرگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتلگاہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شادور جوے خوں میں تیرے تو سن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے، اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ اُستواری، اصلِ ایماں ہے
مرے بُت خانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں، جودی تھی یہ تُو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

خن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جو یا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھو دیں جا کے معدن کو

مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب!
فریدون و جم و کینخرو و داراب و بہمن کو



دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو
 رکھتا ہے، ضد سے، کھینچ کے باہر لگن کے پانو
 دی سادگی سے جان، پڑوں کو ہلکن کے پانو
 ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو
 بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
 ہو کر اسیر، دابتے ہیں، راہزن کے پانو
 مرہم کی جستجو میں، بھرا ہوں جو دور دور
 تن سے ہوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانو
 اللہ رے ذوقِ دشت نور دی کہ، بعدِ مرگ
 ملتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے پانو
 ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
 اڑتے ہوئے اُبھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو
 شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں!
 دُکھتے ہیں آج، اُس بُتِ نازک بدن کے پانو
 غالب! مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو
 پیتا ہوں دھوکے خسرو شیریں سخن کے پانو



واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدہٴ نچیر سے نہ ہو



واں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دلِ محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو
ضعف سے، نقشِ پئے موز ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو!
جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو

یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو
 رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
 نالہٗ مُرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو
 سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
 ہنس کے بولے کہ ”ترے سر کی قسم ہے ہم کو“
 دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ! ولیکن ناچار
 پاسِ بے روقی دیدہ، اہم ہے ہم کو
 تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
 ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

قطعہ

لکھنو آنے کا باعث نہیں گھلتا، یعنی
 ہوں سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
 مقطعِ سلسلہٗ شوق نہیں ہے یہ شہر
 عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
 لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع، غالب!
 جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو



تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگناہ کش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

غالب بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو، یا رب! اور مرا بادشاہ ہو



گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیوں کر ہو!
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیوں کر ہو!

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو!

ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجئے
حیا ہے اور یہی گو گو، تو کیوں کر ہو!

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بُٹوں کی ہو اگر ایسی ہی ہو تو کیوں کر ہو!

اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو!

جسے نصیب ہو، روزِ سیاہ، میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو!

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیوں کر ہو!

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جو، تو کیوں کر ہو!

بتاؤ، اُس مڑہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیوں کر ہو!

مجھے جنوں نہیں، غالب! ولے بقولِ حضور
”فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیوں کر ہو!“



کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو!
 نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو!

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
 سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ”ہم سے سرگراں کیوں ہو!“

کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو
 نہ لادے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو!

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو!

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمد!
 گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو!

یہ کہہ سکتے ہو، ”ہم دل میں نہیں ہیں“، پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو!

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو!

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو!

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو!

کہا تم نے کہ ”کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی“
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں، کیوں ہو!

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!



رہے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
 ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
 بے در و دیوار سا، اک گھر بنایا چاہیے
 کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو
 پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار
 اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو



از مہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
 طوطی کوشش جہت سے مقابل ہے آئینہ



ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ نمکدہ
 جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ
 ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
 دشواری رہ و ستم ہمہاں نہ پوچھ

ی

صد جلوہ رُو بہ رُو ہے جو مرگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منتِ طفلان اٹھائیے

دیوارِ بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردہٴ تبسمِ پنہاں اٹھائیے



مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے
 عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
 آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
 دے داداے فلک! دلِ حسرت پرست کی
 ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہیے
 سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری
 تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
 مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
 اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
 ہے رنگِ لالہ و گل و نرسیں جدا جدا
 بہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
 سرِ پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
 رُو، سوے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
 یعنی بہ حسب گردشِ پیانہ صفات
 عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے
 نشوونما ہے اصل سے، غالب! فروع کو
 خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے



بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداڑ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزرده ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف، تھا یک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکینِ دلِ آزرده کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم!
کہ ہو گا باعثِ افزائشِ دردِ دُروں وہ بھی

نہ اتنا بُرشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریا سے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
لیے بیٹھا ہے اک دوچار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب! شوقِ وصل و شکوہ ہجران
خداوہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی



ہے بزمِ بُناں میں سخنِ آزرده لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدحِ وجہِ پریشانی صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد!
زنہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے

بیدارِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے



تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب! ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے



گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے



غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

گھلے گا کس طرح مضمون مرے مکتوب کا، یارب!
قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

لپٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے
دلے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اُنہیں منظور اپنے زخموں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا، نہ تھا ظالم! مگر تمہید جانے کی

لکد کوپِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی
مری طاقت، کہ ضامن تھی بچوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبی اوضاعِ ابنائے زماں غالب!
بدی کی اس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہائیکی



حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی!
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی



کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
 جس میں کہ ایک بیضہ موز آسمان ہے
 ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
 پر تو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
 حال آنکہ ہے یہ سلی خار اسے لالہ رنگ
 غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
 کی اُس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
 آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
 کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
 بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
 بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوارِ یار میں
 فرمانرواے کشورِ ہندوستان ہے
 ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
 کس سے کہوں کہ داغ، جگر کا نشان ہے
 ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
 غالب! ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے



درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے!
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی سیری غمگساری ہائے ہائے!

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟
دُشمنی اپنی تھی، میری دوستداری ہائے ہائے!

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا!
عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے ہائے!

گلِ فشانے ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!

شرمِ رسوائی سے، جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہاے ہاے!

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبتِ میل گئی
اٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری ہاے ہاے!

ہاتھ ہی تیغِ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہاے ہاے!

کس طرح کاٹے کوئی شبِ ہاے تارِ برشگال
ہے نظرِ خو کردہ اخترِ شماری ہاے ہاے!

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ نا امیدواری ہاے ہاے!

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالب! ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہاے ہاے!



سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکینِ کودے نوید کہ مرنے کی آس ہے

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

کیجئے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تک
ہر مومرے بدن پہ زبانِ پاس ہے

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانہ وفا
ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

پی، جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
اسِ بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرفِ اسد!
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگلِ اداس ہے



گر خاموشی سے فائدہِ اخفا سے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
دلِ فردِ جمع و خرجِ زباں ہاے لال ہے

کس پردے میں ہے آئینہ پرواز، اے خدا!
رحمت، کہ عذرِ خواہِ لبِ بے سوال ہے

ہے ہے 'خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی!
اے شوق! منفعل' یہ تجھے کیا خیال ہے

مشکیں لباسِ کعبہ، علیؑ کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

وحشت پہ میری عرصہٴ آفاق تنگ تھا
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسد!
عالم تمامِ حلقہٴ دامِ خیال ہے



تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
 حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
 ولا! یہ درد و الم بھی تو مُغتنم ہے، کہ آخر
 نہ گریہِ سحری ہے، نہ آہِ نیمِ شمی ہے



ایک جا حرفِ وفا لکھتا تھا، سو بھی مٹ گیا
 ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
 جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر، نہ کیوں!
 ہم نہیں جلتے، نفسِ ہر چند آتش بار ہے
 آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
 ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
 ہے وہی بدستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
 جس کے جلوے سے زمین تا آسماں سرشار ہے
 مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
 زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
 آنکھ کی تصویر سرنا سے پہ کھینچی ہے، کہ تا
 تجھ پہ گھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے



پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے



مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمد!
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے!

نہ لائی شوخی اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا، عہدِ تجدیدِ تمنا ہے



رحم کر، ظالم! کہ کیا بودِ چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وفا، دودِ چراغِ کُشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی، سودِ چراغِ کُشتہ ہے



چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ، تو کہوے کہ دودِ شعلہٴ آواز ہے

پیکرِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ، گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

دستِ گاہِ دیدہٴ کونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے



عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجئے نہ، تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں، ہے کیا رسوائی؟
اے، وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے!
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ حزام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی نہیں

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں!
نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے، اے فلکِ نا انصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدا!
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی



ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ہے خندہ دندانِ نما مجھے

ڈھونڈے ہے اُس مُعْتَنی آتشِ نفسِ کوجی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقی فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

گھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ!
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے



زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری، غالب!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے



اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں، در سے ترے دن صدا کیے!

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن نے
مدت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانما یہ کیا کیے؟

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدد
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں، یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

ضد کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالب! تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے، اور وہ سنا کیے



رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برقِ آفتاب ہے

میناے مے ہے سرو، نشاطِ بہار سے
بالِ تدر، جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادوِ بادہ نوشی، رنداں ہے ششِ جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو، اُس برقی حُسن کا
جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامرادِ دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

گُزرا اسدا! مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے



دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آگینہ سُندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یارب، وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شر ما جائے ہے

شوق کو یہ لنت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُورِ چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے واہ واہ!
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزمِ آرائیاں سُن کر دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعاے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ گھلتا جائے ہے، جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مُصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جس قدر، اتنا ہی کھینچتا جائے ہے

سایہ میرا، مجھ سے مثلِ دُور بھاگے ہے، اسدا!
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے!



گرمِ فریاد رکھا، شکلِ نہالی نے مجھے
 تب اماں ہجر میں دی، بردلیانی نے مجھے
 نیسہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت، معلوم!
 لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
 کثرتِ آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
 کر دیا کافرِ ان اصنامِ خیالی نے مجھے
 ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
 عجب آرام دیا بے پر وبالی نے مجھے



کارِ گاہِ ہستی لالہ داغِ ساماں ہے
 برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
 غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم
 باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں ہے
 ہم سے رنجِ بے تابِ کس طرح اٹھایا جائے!
 داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دندان ہے



اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہٴ غالب!
 ہم بیاباں میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے



سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا، مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ ناامیدی! خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچے، داماندگی کو عشق ہے
اٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی
فتنہ شورِ قیامت، کس کی آب و گل میں ہے؟

ہے دلِ شوریدہ غالبِ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ، کس مشکل میں ہے



دل سے جری نگاہ، جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذتِ فراغ!
تکلیفِ پردہ داری زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شباب کی سر مستیاں کہاں!
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری، گونے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی، کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسنِ پرستی شعار کی
اب آبروے شیوہِ اہلِ نظر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا ودی کا تفرقہ یک بارمٹ گیا
کل تم گئے کہ، ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں! تمہیں
وہ وَلولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟



تسکین کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظرِ ملے
حورانِ خلد میں تری صورت گر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم!
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچہٴ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے



کوئی دن، گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی، کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاصدِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلاے آسانی اور ہے

ہو چکیں، غالب! بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے



کوئی امید نہ نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتا
 موت کا ایک دن مُعین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
 آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
 جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
 ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
 کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی
 داغِ دل گر نظر نہیں آتا یو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟
 ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
 مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے، غالب!

شرم تم کو مگر نہیں آتی!



دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟
ہم ہیں مُشتاق، اور وہ بیزار
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
کاش پوچھو کہ ”مَدَّعا کیا ہے؟“

ق

جب کہ تجھ دن نہیں کوئی موجود
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہو گا
جان تم پر نثار کرتا ہوں

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
نگہِ چشمِ سُرْمہ سا کیا ہے؟
اَبَر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
اور درویش کی صدا کیا ہے
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب!

مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے



کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ عالیہ مُو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

ہوں کش مکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ، گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دو شینہ کی مُو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب! کون سُنے طعنہ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس دَر پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اڑِ گر یہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب!
ہم بھی گئے واں، اور تری، تقدیر کو رو آئے



پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
 پھر جگر کھودنے لگا ناخن
 قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز
 چشمِ دلّالِ جنسِ رسوائی
 وہی، صد رنگ نالہ فرسائی
 وہی، صد گونہ اشکباری ہے
 دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
 دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر
 جلوه پھر عرضِ ناز کرتا ہے
 سینہ جویاے زخمِ کاری ہے
 آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
 پھر وہی پردہِ عماری ہے
 محشرِ ستانِ بیقراری ہے
 روزِ بازارِ جاں سپاری ہے
 پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

پھر گھلا ہے درِ عدالتِ ناز
 ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
 پھر دیا پارہ جگر نے سوال
 پھر ہوئے ہیں گواہِ عشقِ طلب
 دل و مرگاں کا جو مقدمہ تھا
 گرم بازارِ فوجداری ہے
 زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
 ایک فریاد و آہ و زاری ہے
 اشکباری کا حکم جاری ہے
 آج پھر اُس کی روبکاری ہے
 بیخودی، بے سبب نہیں، غالب!
 کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے



بچوں تہمت کشِ تسکین نہ ہو، گر شادمانی کی
 نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی
 کشاکشِ ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
 ہوئی زنجیر، موجِ آبِ کو، فرصتِ روانی کی
 پس از مُردن بھی دیوانہ زیارتِ گاہِ طفلان ہے
 شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلِ فشانی کی



نکوہش ہے سزا، فریادی بیدارِ دلبر کی
 مبادا خندہٴ دندان نما ہو صبحِ محشر کی!
 رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
 اگر بودے بجائے دانہ، دہقاں نوکِ نشتر کی
 پر پروانہ شاید بادبانِ کشتی مے تھا
 ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
 کروں بیدارِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت!
 کہ طاقت اڑ گئی، اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
 کہاں تک رُوؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
 بری قسمت میں یارب! کیا نہ تھی دیوارِ پتھر کی؟



بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اتنے ہی کم ہوئے

پہاں تھا دامِ سخت، قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر!
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی، کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تنہی خو! جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق
جو پانو اٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھینچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسد! نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے



جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
 تو فردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
 مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی
 کبھی کود کی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
 یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
 کہ ”برے عدو کو، یارب! ملے میری زندگانی“



ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
 اک شمع ہے دلیلی سحر، سو غموش ہے
 نے مژدہ وصال، نہ نظارہ جمال
 مدت ہوئی کہ آستی چشم و گوش ہے
 نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
 اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
 گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا!
 کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے

دیدارِ بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہِ مست
بزمِ خیالِ میکدہ بے خروش ہے



اے تازہ وارِ دانِ بساطِ ہوائے دل!
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدہٴ عبرتِ نگاہ ہو
میری سُنو، جو گوشِ نصیحتِ نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب، بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے
نطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحِ دم جو دیکھیے آ کر، تو بزمِ میں
نے وہ سرور و سُور، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامینِ خیال میں
غالب! صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے



آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازہٴ خمار نہیں ہے

گر یہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہاے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گلِ آئینہٴ بہار نہیں ہے

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے
واے، اگر عہد استوار نہیں ہے

تو نے تم نے کسی کی کھائی ہے، غالب!
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے



ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
 کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
 رفوے زخم سے مطلب ہے لذت زخمِ سوزن کی
 سمجھو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
 وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
 چٹکنا غنچہ گل کا، صدائے خندہ دل ہے



پا بہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد
 خارِ پا ہیں جو ہر آئینہ زانو مجھے
 دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
 ہے نگاہِ آشنا، تیرا سر ہر نو مجھے
 ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
 ہے یہی بہتر کہ، لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے



جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالجِ صورتِ دیوار میں آوے

سایے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب نازِ گراں مایگی اشک بجا ہے
جب لختِ جگر دیدہ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر!
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب!
 اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رَشک سے جب وہ تِنِ نازک
 آغوشِ خمِ حلقہ زُتار میں آوے

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
 کیوں شاہدِ گلِ باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ ناداں!
 جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
 اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھیے
 جو لفظ کہ غالب! مرے اشعار میں آوے



حُسنِ مہر، گرچہ بہ ہنگامِ کمالِ اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خُشیدِ جمالِ اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مالِ اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جسم سے مرا جامِ سفالِ اچھا ہے

بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا، جس کو نہ ہو ٹوٹے سوالِ اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ، بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بچوں سے کیا فیض!
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال، اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے، تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے، جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب! یہ خیال اچھا ہے



نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

خارِ خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوقِ کلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

مے پرستاں! خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ یہ خانہ لیلی، نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی، نعمتِ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالب! اگر عمرِ طبعی، نہ سہی



عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا، خرابِ بادۂ اُلفت
فقط ”خراب“ لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے دادِ اس بچوں شوق کی دنیا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو اے طرہ ہاے خم بہ خم! آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجِ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم، آگے



شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے، تو گلا ہوتا ہے

پڑ ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک زرا چھیڑنے پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے، سرگرم جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رُو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا، پدے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

قطعہ

خامہ میرا، کہ وہ ہے بارِ بدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے!

اے شہنشاہِ کواکب سچ مہرِ علم!
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجئے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے مہہ ناصر سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوقِ فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے



ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کو ”تو کیا ہے“؟
تمہیں کہو کہ ”یہ اندازِ گفتگو کیا ہے“؟

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ مُندِ نُو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخنِ تم سے
وگر نہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا، ہن
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
گریدتے ہو جو آبِ راکھ، جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے، ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز، جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو، کیا ہے!

پیوں شراب، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے!

رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہے کہ آرزو کیا ہے!

ہوا ہے شہہ کا مُصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



میں اُنہیں چھیڑوں، اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے، جو مے پے ہوئے

قہر ہو، یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاش کے، تم مرے لئے ہوتے!

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب! کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالب!
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے



غیر لیں محفل میں، بو سے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا ثَم سے کیا شکوہ، کہ یہ
ہتکھنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے، گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے، اور صبح دم
دھوئے دھبے جامہٴ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے؟

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے، کب دن پھریں حمام کے!

عشق نے غالب! نکلتا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے



پھر اس انداز سے بہار آئی
 دیکھو اے ساکنانِ خطّہ خاک!
 کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
 سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
 سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
 ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
 کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
 اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
 رُو کشِ سطحِ چرخِ مینائی
 بن گیا رُوئے آپ پر کائی
 چشمِ نرگس کو دی ہے مینائی
 بادہ نوشی ہے بادِ پیائی
 کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالب!
 شاہِ دیندار نے شفا پائی



تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجزِ عالی ہے
 اگر پہلو تہی کیجئے، تو جا میری بھی خالی ہے
 رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
 بھرے ہیں جس قدر جامِ وسبو، میخانہ خالی ہے



کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
 خلشِ غمزہ خوں ریز نہ پوچھ!
 کیا بیاں کر کے مرا، روئیں گے یار
 ہوں زخود رفتہ بید اے خیال
 متقابل ہے، مقابل میرا
 قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
 گردِ بادِ رہ بیتابی ہوں
 دہنِ اُس کا جو نہ معلوم ہوا
 کر دیا ضعف نے عاجز، غالب!
 تنگ پیری ہے جوانی میری
 اور پھر وہ بھی زبانی میری
 دیکھ خو نا بہ نشانی میری
 مگر آشفته بیانی میری
 بھول جانا ہے نشانی میری
 رُک گیا، دیکھ روانی میری
 سخت ارزاں ہے گرانی میری
 صر صر شوق ہے بانی میری
 گھل گئی ہیچ مدانی میری



نقشِ نازِ بُتِ طناز، بہ آغوشِ رقیب
 پائے طاؤسِ پئےِ خلمہٴ مانی مانگے
 تو وہ بد خو کہ، تحیر کو تماشا جانے
 غم وہ افسانہ کہ، آشفۃِ بیانی مانگے
 وہ تب عشقِ تمنا ہے کہ، پھر صورتِ شمع
 شعلہ تا نہضِ جگر ریشہٴ دوانی مانگے



گلشنِ کوتری صحبت از بس کو خوش آئی ہے
 ہر غنچے کا گل ہونا، آغوشِ کشائی ہے
 واں کنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر
 یاں نالے کو اور اُلٹا، دعوائے رسائی ہے
 از بکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
 جو داغِ نظر آیا، اک چشمِ نمائی ہے



جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی
لکھ دیجیو یا رب! اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگلتشِ جنائی کا تصور
دل میں نظر آتی ہے اک بوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ رسو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام، کہ اک عمر سے 'غالب'!
حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جو کی



سیماب، پشت گرمی آئینہ دے ہے ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

آغوشِ گلِ کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل، ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں
معتوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے



چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے خدر
جائے، اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل!
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر، جیب، بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ، ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

مُنْخَر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل! ان مہہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے



ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے، بیاباں مجھ سے

درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہِ رشتہ شیرازہ مرگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

غمِ عشاق نہ ہو، سادگی آموزِ بجاں
کس قدر خانہ آئینہ ہے دیراں مجھ سے

اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحراے بچوں
صورتِ رشتہ گوہر سے چراغاں مجھ سے

بیخودی بسترِ تمہید فراغت ہو جو!
ہرے سائے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے
ہونگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے

بیکسی ہاے شبِ ہجر کی وحشت ہے، ہے!
سایہ خُرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے، اسد!
ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے



نکتہ چیں ہے، غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبہِ دل!
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ، اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا
ہاتھ آئیں، تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ پھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ دن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بکلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتشِ غالب!
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے



چاک کی خواہش، اگر وحشت بہ عریانی کرے
صبح کے مانند، زخمِ دل گریبانی کرے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گریبانی خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نو مید یارب! کب تک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گرا نجانا کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ نازے پاوے شکست
مُوے شیشہ دیدۂ ساغر کی مرگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد
یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے



وہ آ کے، خوابِ میں، تسکینِ اضطراب تو دے
 ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاؤٹ میں تیرا رو دینا
 تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کو ہم کر
 نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اُوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
 پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے

اسد! خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے
 کہا جو اُس نے، ”زرا میرے پانو داب تو دے“



تپش سے میری، وقفِ کش مکش، ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سر شکِ سر بہ صحرا دادہ، نوزِ العینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا اُفتادہ برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو
فروعِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بُوِ بالش سے، اُس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا، عارِ بستر ہے

کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالب!
کہ بے تابی سے ہر یک تارِ بستر، خارِ بستر ہے



خطر ہے، رشتہ اُلفتِ رگِ گردن نہ ہو جائے
 غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دُشمن نہ ہو جائے
 سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشو و نما، غالب!
 اگر گلِ سر و کے قامت پہ پیرا ہن نہ ہو جائے



فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
 کیوں بوتے ہیں باغباں تو بنے؟
 ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
 ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
 شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے
 کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد!
 نالہ پابندِ نئے نہیں ہے
 گر باغِ گدائے مے نہیں ہے
 پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے
 ہر چند کہیں کہ، ہے نہیں ہے
 اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
 مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالب!

آخر تو کیا ہے، ”اے نہیں ہے؟“



نہ پوچھ نسوٰ مرہمِ جراحتِ دل کا
 کہ اس میں ریزہ الماس جزوِ اعظم ہے
 بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
 وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے



ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
 مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے
 در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
 ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
 یہ باعثِ نومیدی، اربابِ ہوس ہے
 غالب کو برا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے



کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
 خطِ پیاہ، سراسر نگاہِ گلچیں ہے
 کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے!
 کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
 بجا ہے، گر نہ سنے، نالہ ہائے بلبلِ زار
 کہ گوشِ گل، نمِ شبِ نم سے پنبہ آگیاں ہے
 اسد ہے نزع میں، چل بیوفا! برائے خدا!
 مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکین ہے



کیوں نہ ہو چشمِ بٹیاں مجھ تغافل، کیوں نہ ہو؟
 یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
 مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
 واے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
 ماضِ گل دیکھ، رُوے یار یاد آیا، اسدا!
 جو ششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے



دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے کیا کہیے
 ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوئے اور آئے ہن نہ رہے
 قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے!

رہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
 اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے؟

زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ دن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے!

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں، وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ، سرِ رہگزر ہے کیا کہیے؟

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتہ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا کہیے!

انہیں سوال پہ زعمِ بچوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیے؟

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجئے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے!

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں، لیکن
سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کہیے



دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
 کر گئی وابستہ تن میری عریانی مجھے
 بن گیا تیغِ نگاہیار کا سنگِ فساں
 مرجبا میں! کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے
 کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جہم ہے
 جانتا ہے جو پرش ہاے پنہانی مجھے
 میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
 لکھ دیا منجملہ اسبابِ ویرانی مجھے
 بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے!
 اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے
 واے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
 لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
 وعدہ آنے کا وفا کیجئے، یہ کیا انداز ہے؟
 تم نے کیوں سوئی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے؟
 ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!
 پھر ہوا ہے تازہ سوداے غزل خوانی مجھے
 دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
 میزا یوسف ہے، غالب! یوسف ثانی مجھے



یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے
سُجھتا زاہد ہوا ہے، خندہ زیر لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ در، رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانہ مکتب مجھے

یارب! اس آشفنگی کی داد کس سے چاہیے!
رشک، آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں!
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے



حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی!
اُسے یوسف کی بُوے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں، 'دیکھو نہ کہیو پھر کہ' "غانفل تھے"
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو بہتر
غرضِ شستِ بُتِ ناوکِ فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُسمہ و زُتار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زُلفِ پُرِ شکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو!
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالب!
نئے فتنوں میں اب چرخِ گنہن کی آزمائش ہے



کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
 جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے
 خدایا! جذبہٴ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے!
 کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کچھتا جائے ہے مجھ سے
 وہ بدخو، اور میری داستانِ عشق طولانی
 عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے
 ادھر وہ بدگمانی ہے، ادھر یہ ناتوانی ہے
 نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے
 سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی! کیا قیامت ہے!
 کہ دامنِ خیالِ یار، مٹھوٹا جائے ہے مجھ سے
 تکلف بر طرف، نظارگی میں بھی سہی، لیکن
 وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
 ہوئے ہیں پانو ہی پہلے، نبردِ عشق میں زخمی
 نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
 قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب!
 وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!



زبسکہ مشقِ تماشا بجوں علامت ہے
کشاد و بست مژہ، سلی ندامت ہے

نہ جانوں، کیونکہ مئے داغِ طعنِ بد عہدی
تجھے کہ آئینہ میں بھی ورطہٴ ملامت ہے

بہ پیچ و تاب ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ
نگاہِ عجز سرِ رشتہٴ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بیاد
بجوں ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے!



لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آ جائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلاؤ پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ، زرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے



باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے، اورنگِ سلیمان مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ میجا مرے آگے

جُز نام، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں، صحرا مرے آگے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیانہ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں، ”لو نام نہ اُن کا مرے آگے“

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، یہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پروصل میں یوں مر نہیں جاتے!
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلم خونِ کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہماز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے؟



کہوں جو حال، تو کہتے ہو، ”مَدَّ عا کہیے“
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو، تو کیا کہیے

نہ کہو طعن سے پھر تم، کہ ”تم ستمگر ہیں“
مجھے تو خُو ہے، کہ جو کچھ کہو، ”بجا کہیے“

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے؟

نہیں ذریعہٴ راحت، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مَدَّعی بنے، اس کے نہ مَدَّعی بنے
جو ناسزا کہے، اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جان کا ہی مَرَض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے
کبھی حکایتِ صبرِ گریزِ پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجئے
کٹے زبان، تو خنجر کو مرجبا کہیے

نہیں نگار کو اُلفتِ نہ ہو، نگار تو ہے
روانی روش و مستی ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبی ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب!
خدا سے کیا ستم و بھورِ نا خدا کہیے!



رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

صرف بہاے مے ہوئے، آلاتِ میکش
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

زسواے دہر گو ہوئے آوارگی سے، تم
بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالہ بلبیل کو بے اثر؟
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا!
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ، بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اُس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے



نقہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہامستِ طرب
 شیشہٴ مئے، سردِ سبزِ جویبارِ نغمہ ہے
 ہمنشیں مت کہہ کہ ”برہم کرنے بزمِ عیشِ دوست“
 واں تو، میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے



حُسنِ بے پروا، خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
 آئینہ زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
 تا کجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باختن؟
 چشمِ واگر ویدہ، آغوشِ و داعِ جلوہ ہے



عرضِ نازِ خموشیِ دنداں، برائے خندہ ہے
دعویٰ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ، محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام
ورنہ دنداں وہ دلِ افسردن، بنائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احبابِ منکر ورنہ یاں
دلِ محیطِ گریہ و لبِ آشنائے خندہ ہے



جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کو تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

عالمِ غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر
کب تک خیالِ طرہ لیلیا کرے کوئی

افسردگی نہیں طربِ انشائے التفات
ہاں، دردِ بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو، عقدہٴ دل وا کرے کوئی

چاکِ جگر سے، جب رہِ پرش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، شاخِ گل
تاچند باغبانی صحرا کرے کوئی

ناکامی نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ، تجھ کو تماشا کرے کوئی

ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہر شکست
نقصاں نہیں، جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سرِ بر ہوئی نہ وعدہ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ، تیری تمنا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجادِ یاس خیر
یہ درد وہ نہیں کہ، نہ پیدا کرے کوئی

بیکاریِ جوں کہ، ہے سرِ پٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخنِ دور ہے، اسدا!
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی



ابن مریم ہوا کرے کوئی
 شرع و آئین پر مدار سہی
 چال، جیسے کڑی کمان کا تیر
 بات پر واں زبان کثتی ہے
 بگ رہا ہوں بچوں میں کیا کیا کچھ!
 نہ سُو، گر بُرا کہے کوئی
 روک لو، گر غلط چلے کوئی
 کون ہے، جو نہیں ہے حاجتمند؟
 کیا کیا خضر نے سکندر سے!

میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
 ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟
 دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!
 وہ کہیں اور سُننا کرے کوئی
 کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
 نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
 بخش دو، گر خطا کرے کوئی
 کس کی حاجت روا کرے کوئی
 اب کسے رہنما کرے کوئی؟

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب!

کیوں کسی کا گلا کرے کوئی؟



بہت سہی غمِ گیتی، شرابِ کم کیا ہے!
غلامِ ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے!

تمہاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے؟

کٹے، تو شب کہیں؛ کاٹے، تو سانپ کہلا دے
کوئی بتاؤ کہ، وہ زلفِ خمِ بخم کیا ہے؟

لکھا کرے کوئی، احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ، دھاں جنبشِ قلم کیا ہے!

نہ خشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

وہ داد و دید گرانما پہ شرط ہے، ہمد!
وگر نہ مہرِ سلیمان و جام و جم کیا ہے!

خن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے



باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایہ شاخِ گل، انہی نظر آتا ہے مجھے

جوہر تیغ بہ سرِ چشمہ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

مُدعا محو تماشاے شکستِ دل ہے
آئینہ خانہ میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

نالہ، سرمایہ یک عالم و عالم، کفِ خاک
آسماں بیضہ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں، اے مرگے پر، کون اٹھاتا ہے مجھے؟



روندی ہوئی ہے کو کبہ شہر یار کی
 اترائے کیوں نہ خاکِ سرِ رہ گزار کی
 جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
 لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
 بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
 کیوں کر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی



کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے
 بے تکلف، اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے
 بیضہ آسا تنگ بال و پر پہ ہے کنجِ قفس
 از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے



ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل، کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خون، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یوں دم بدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے، ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اُس طرۂ پدِ پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے، بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع، خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ حسدِ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم، نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ، غالب! اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے



مستی بہ ذوقِ غفلت ساقی ہلاک ہے
 موجِ شراب، یکِ مژدہ خوابِ ناک ہے
 جُز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
 جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدا!
 صحرا ہماری آنکھ میں یکِ مُشتِ خاک ہے



لبِ عیسیٰ کی جُتیش، کرتی ہے گہوارہ جُنبانی
 قیامت، کشتہ لعلِ بٹاں کا خوابِ سنگیں ہے



آمدِ سیلابِ طوفانِ صداے آب ہے
 نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنکلی جادہ سے
 بزمِ مئے، وحشتِ کدہ ہے، کس کی چشمِ مست کا؟
 شیشہ میں نبضِ پری پہاں ہے، موجِ بادہ سے



ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برادے



سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شہائے ہجران کی



ہجومِ نالہ حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغان ہے
خموشیِ ریشہ صد نیتاں سے خس بدنداں ہے
تکلف برطرف، ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ غریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف، کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید، مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا ہے
غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے، عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے



خموشیوں میں، تماشا ادا نکلتی ہے
 نگاہِ دل سے ترے، سُرمہ سا نکلتی ہے
 فشارِ تنگی، خلوت سے بنتی ہے شبِ بنم
 صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
 نہ پوچھ سینہ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
 کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے



جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے
 ناف، دماغِ آہوے دشتِ تار ہے

کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو؟ اے خدا!
 آئینہ فرسِ ششِ جہتِ انتظار ہے

ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق
 گردامِ یہ ہے، وسعتِ صحرا شکا ہے

دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

چھڑ کے ہے شبِ نیم آئینہ برگِ گل پر آب
اے عندلیب؛ وقتِ وداعِ بہار ہے

سچ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سُوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر
ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

اے عندلیب! یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیری ہی سہی
اے بے دماغ! آئینہ تماشال دار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسدِ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے



آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا، تری بزمِ خیال میں
گلدستہ نگاہ، سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا!
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

سر پر، ہجومِ دردِ غربی سے ڈالے
وہ ایک مُشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
شوقِ عنانِ گسیختہ، دریا کہیں جسے

درکار ہے، شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبحِ بہار، پُنبہ مینا کہیں جسے

غالب! بُرا نہ مان، جو واعظِ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ، سب اچھا کہیں جسے؟



شبِ نیم بہ گلِ لالہ، نہ خالی زادا ہے
داغِ دل بیدرد، نظرِ گاہِ حیا ہے

دلِ خونِ شدہ کش مکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بدستِ حنا ہے

شعلہ سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے؟

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ، بہ اندازِ گل، آغوشِ کُشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبلی قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگر سوختہ کیا ہے؟

ہونے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی، طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاری اُلفت
دستِ تیرے سنگِ آمدہ، پیمانِ وفا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم، آئینہٴ تصویرِ نما ہے

اے پر تو خُرشیدِ جہانتاب! ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو، غالب!
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان! خدا ہے



منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی
قسمت کھلتی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صُور کی

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بُتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ، سب کو ملے ایک سا جواب!
آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام ہیں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایتِ ضرور کی

غالب! گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی



غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
 یہ رنج کہ کم ہے بے گلفام بہت ہے
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
 ہے یوں کہ مجھے دُر دِ تہِ جام بہت ہے
 نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کیمیں میں
 گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
 کیا زہد کو مانوں کو نہ ہو گرچہ ریائی
 پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
 ہیں اہلِ خرد، کس روشِ خاص پہ نازاں؟
 پا بستگی رسم و رہِ عام بہت ہے
 زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
 آلودہ بہ نئے جامہٴ احرام بہت ہے
 ہے قہر گراب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو
 انکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے
 خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ!
 رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے
 ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
 شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے



مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مرگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پُرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامہٴ مرثگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ گوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں، نامہٴ دلدار کھولنا
جاں، نذرِ دل فریبی عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہِ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
سُرمہ سے تیز دشنہٴ مرگاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تا کے ہے پھر، نگاہ
چہرہ فروغِ نئے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی، ڈھونڈھتا ہے پھر، وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصویرِ جاناں کیے ہوئے

غالب! ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیہٴ طوفاں کیے ہوئے



نویدِ امن ہے بیدارِ دوست جاں کے لئے
 رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے، گر مرثہ یارِ تشنہِ خوں ہے
 رکھوں کچھ اپنی بھی مرثگانِ خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلقِ اے خضر!
 نہ تم کو چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلاے آفتِ رشک
 بلاے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک! نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
 دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
 کرے قفس میں فراہم خسِ آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا، مری جو شامت آئے
اٹھا، اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنکناے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت، مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیشِ تجملِ حسینِ خان کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دویں اور مُعینِ مِلّت و مُلک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے مَجْرِ ارایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

وَرَقِ تمام ہوا، اور مدحِ باقی ہے
سفینہ چاہیے اِس بحرِ بیکراں کے لئے

اداے خاص سے غالبِ ہوا ہے نکتہ سرا
صلاے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!

منقبت میں

سازِ یک ذرّہ، نہیں فیضِ چمن سے بیکار
 سایہِ لالہ بیدارغ، سوید اے بہار
 مستی بادِ صبا سے، ہے بہ عرضِ سبزہ
 ریزہ شیشہ مے، جوہر تیغِ گھسار
 سبز ہے، جامِ زمرد کی طرح، داغِ پلنگ
 تازہ ہے، ریشہِ نارنج صفت، رُوے شرار
 مستی ابر سے، گلچینِ طرب ہے، حسرت
 کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
 کوہ و صحرا ہمہ معموری شوقِ بلبل
 راہِ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار
 سوئے ہے فیضِ ہوا، صورتِ مرگانِ یتیم
 سرنوشتِ دو جہاں ابر، بیکِ سطرِ غبار
 کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال
 قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
 کف ہر خاکِ بہ گردوں شدہ، قمری پرواز
 دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤسِ شکار
 میكدے میں ہو اگر آرزوے گلِ چینی
 بھول جا، یک قدرِ بادہ بہ طاقِ گلزار

موجِ گل ڈھونڈھ مخلوتکدہ غنچہ باغ
 گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار
 کھینچے گر مانی اندیشہ، چمن کی تصویر
 سبز مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِ پرکار
 لعل سی، کی ہے، پے زمزمہ مدحتِ شاہ
 طوطی سبزہ کہسار نے پیدا منقار
 وہ شہشاہ کہ، جس کی پے تعمیر سرا
 چشمِ جبریل ہوئی قالبِ نشتِ دیوار
 فلکِ العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
 رشتہ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
 سبزہ نہہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
 رفعتِ ہمتِ صد عارت و یک اوجِ حصار
 واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاش
 وہ رہے مروحہِ بالِ پری سے بیزار
 خاکِ صحراے نجف، جوہرِ سیرِ عرفاء
 چشمِ نقشِ قدم، آئینہ بختِ بیدار
 ذرہ اُس گرد کا، خورشید کو آئینہ ناز
 گرد اُس دشت کی، امید کو، احرامِ بہار
 آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستی ناز
 عرضِ خمیازہ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار!
دلِ پروانہ چراغاں، پر بلبلِ گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہو اے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بُرے گردوں
سلکِ اختر میں مہر نو، مژدہ گوہر بار
ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں، زمزمہِ نعمتِ نبی
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ، یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مرثگان و دگر سو غم خار
مردمک سے ہو عزا خانہ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے، جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانہ دہر
عرضِ خمیازہ سیلاب ہو، طاقِ دیوار
دیدہ تا دلِ اسد، آئینہ یک پر تو شوق
فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

منقبت میں

دہر، جُزِ جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
 ہم کہاں ہوتے، اگر حُسن نہ ہوتا خود ہیں
 بیدلی ہاے تماشا! کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
 بیکسی ہاے تمنا! کہ نہ دُنیا ہے، نہ دیں
 ہر زہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
 لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکین
 نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت
 سخنِ حق ہمہ، پیانۂ ذوقِ تحسین
 لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم!
 دُرِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں
 مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
 صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکین
 عشق، بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس

وصل، زنگارِ رخِ آئینہِ حُسنِ یقین
 کوہکن، گر سنہِ مزدورِ طربِ گاہِ رقیب
 بے ستوں آئینہِ خوابِ گرانِ شیریں
 کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتشِ خیز؟
 کس نے پایا، اثرِ نالہِ دلہائے حزیں؟
 سامعِ زمزمہِ اہلِ جہاں ہوں لیکن
 نہ سروِ برگِ ستائش، نہ دماغِ نفیس
 کس قدر ہر زہِ سرا ہوں کہ، عیاذاً باللہ!
 یکِ قلمِ خارجِ آدابِ وقار و تمکین
 نقشِ لاحول، لکھ، اے خامہِ ہڈیاں تحریر!
 ”یا علی“ عرض کر، اے فطرتِ وسواسِ قریں!
 مظہرِ فیضِ خدا، جان و دل ختمِ رسل
 قبلہِ آلِ نبی، کعبہِ ایجادِ یقین
 ہو، وہ سرمایہِ ایجاد، جہاں گرمِ خرام
 ہر کفِ خاک، ہے واں، گردہِ تصویرِ زمیں
 جلوہ پروازِ ہو نقشِ قدمِ اُس کا، جس کا
 وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
 نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے
 ابدأِ پُشتِ فلک، خمِ شدہِ نازِ زمیں
 فیضِ خلقِ اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا

بوے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
 برشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا
 قطع ہو جائے نہ سرِ رشتہ ایجاد کہیں
 کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
 رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بختانہ چیں
 جاں پناہ! دل و جاں فیضِ رسانا! شاہا!
 وصیِ ختمِ رسل تو ہے، بہ فتوایِ یقین
 جسمِ اطہر کو تے، دوشِ پیمبر، منبر
 نامِ نامی کو ترے، ناصیہِ عرش، نگین
 کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟
 شعلہٴ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
 آستاں پر ہے ترے جو ہر آئینہٴ سنگ
 رقمِ بندگی حضرتِ جبریلِ امیں
 تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ
 خاکوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
 تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں
 تیری تسلیم کو ہیں، لوح و قلم، دست و جبیں
 کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا؟
 کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟
 جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد

کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
 شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
 ہے ترے حوصلہٴ فضل پر از بس کہ یقین
 دے دعا کو مری، وہ مرتبہٴ حُسنِ قبول
 کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار، ”آمین“
 غمِ شتیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
 کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
 طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمی شوق
 کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
 دلِ الفتِ نب و سینہٴ توحیدِ فضا
 نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدقِ گزیریں
 صرفِ اعداء، اثرِ شعلہٴ دُورِ دوزخ
 وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں



جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
یہی انداز اور یہی اندام
بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
تجذاً اے نشاطِ عامِ عوام!
لے کے آیا ہے عید کا پیغام
صبح جو جائے اور آئے شام
تیرا آغاز اور ترا انجام
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام؟
ایک ہی ہے امید گاہِ انام
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟
تب کہا ہے بطریزِ استفہام
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

ہاں مہِ نو! سنیں ہم اُس کا نام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
مرحبا، اے سرورِ خاصِ خواص!
عذر میں تین دن نہ آنے کے
اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
ایک میں کیا، کہ سب نے جان لیا
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
جانتا ہوں کہ، آج دنیا میں
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہِ بگوش
جانتا ہوں کہ، جانتا ہے تو
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ

ق

جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

تجھ کو کیا پایہِ روشناسی کا
جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
ماہِ بن، ماہتابِ بن میں کون!

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
 ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
 جو کہ بخشیکا تجھ کو فر فرورغ
 جب کہ چودہ منازلِ فلکی
 تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
 دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
 پھر غزل کی روش پہ چل نکلا

غزل

ار کے لین دین سے کیا کام
 گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام
 کیا نہ دے گا مجھے مے گلفام!
 کر چکے قطع تیری تیزیِ گام
 گوے و مشکوے و صحن و منظر و بام
 اپنی صورت کا اک بلوریں جام
 تو سنِ طبع چاہتا تھا لگام

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
 مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
 بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے
 کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس
 اُس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد
 بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار
 چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
 کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
 کون ہے، جس کے در پہ ناصیہ سا
 تو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن
 قبلہ چشم و دل بہادر شاہ

تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
 غم سے جب ہو گئی ہو زیتِ حرام
 کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
 اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
 چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
 دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام
 کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام؟
 اے پری چہرہ پیک تیز خرام!
 ہیں مہر و مہر و زہرہ و بہرام
 نامِ شاہنشہ بلند مقام
 مظہر ذوالجلال والا کرام

نو بہارِ حدیقہٴ اسلام
 جس کا ہر قول، معنی الہام
 رزم میں اوستادِ رستم و سام
 اے ترا عہدِ فرخی فرجام
 لوحِ اللہ! عارفانہ کلام
 جُرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام
 ایرج و تور و خسرو و بہرام
 گیو و گودرز و بیژن و رہام
 آفریں، آبِ داریِ صمصام!
 تیغِ کو تیری، تیغِ خصمِ نیام

شہسوارِ طریقہٴ انصاف
 جس کا ہر فعل، صورتِ اعجاز
 بزم میں میزبانِ قیصر و جم
 اے ترا لطف، زندگی افزا
 چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ
 جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
 وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے
 زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
 مرحبا، ہوشگانیِ ناوک!
 تیر کو تیرے، تیرِ غیر، ہدف

ق

برق کو دے رہا ہے کیا الزام
 تیرے رخسِ سبکِ عنان کا خرام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
 تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا

ق

گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
 کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
 صفحہ ہائے لیالی و ایام
 مجملہٴ مُندرج ہوئے احکام
 لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

فنِ صورتگری میں تیرا گرز
 اُس کے مضروب کے سروتن سے
 جب ازل میں رقمِ پذیر ہوئے
 اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا
 لکھ دیا شاہدوں کو عاشقِ کُش

گنبدِ تیز گرد، نیلی فام
 خال کو دانہ اور زُلف کو دام
 وضعِ سوز و نم و رم و آرام
 ماہِ تاباں کا اِسْم، شحْنہ شام
 دی بدستور صورتِ ارقام
 اُس رقم کو دیا طرازِ دوام
 ہو ابد تک رسائی انجام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
 حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
 آتش و آب و باد و خاک نے لی
 مہرِ رخشاں کا نام، خسرو روز
 تیری توقعِ سلطنت کو بھی
 کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
 ہے ازل سے ردائی آغاز

قصیدہ

مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
 شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا
 صبح کو رازِ بہ و اختر کھلا
 دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
 موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
 اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا
 بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا
 رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
 کعبہٴ امن و اماں کا در کھلا
 خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
 رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

صُح دم دروازہٴ خاور کھلا
 خسروِ انجم کے آیا صرف میں
 وہ بھی تھی اک سیما کی سی نمود
 ہیں کو اکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
 سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
 صبح آیا جانبِ مشرق نظر
 تھی نظر بندی، کیا جب ردِ سحر
 لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
 بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
 تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا
 شاہِ روشن دل، بہادر شہہ کہ ہے

مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا
عقدہ احکامِ پیغمبر کھلا
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
واں لکھا ہے چہرہ قیصر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
روشاسوں کی جہاں فہرست ہے

قطعہ

تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
تو کہے، بختانہ آزر کھلا
منصبِ مہر و مہمہ و محور کھلا
میری حدِ وسع سے باہر کھلا
کس نے کھولا، کب کھلا، کیونکر کھلا؟
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
لوگ جانیں طلبہٴ عنبر کھلا

تو سنِ شہہ میں وہ خوبی ہے کہ جب
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار
ہو جہاں گرمِ غزلِ خوانی نفس

غزل

کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا!
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا!
رہروی میں پردہ رہبر کھلا

گنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
ہم پُکاریں اور گھلے یوں کون جائے؟
ہم کو ہے اس راز داری پر گھمنڈ
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں!
مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ!

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک! آگ بھڑکی منہ اگر دم بھر کھلا
 نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
 دیکھو، غالب سے گر اُلجھا کوئی!

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر، ہوا مدحت طرازی کا خیال پھر مہمہ و خرشید کا دفتر کھلا
 خامہ سے پائی طبیعت نے مدد باد باں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا
 مدح سے ممدوع کی دیکھی شکوہ یاں عرض سے رتبہ جوہر کھلا
 مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا بادشہ کا رایت لشکر کھلا
 بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب اب علو پایہ منبر کھلا
 سکہ شہ کا ہوا ہے روشناس اب عیارِ آبروے زر کھلا
 شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ اب مالِ سعی اسکندر کھلا
 ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے اب فریب طغرل و سخر کھلا
 ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے دفتر مدح جہاں داور کھلا
 فکر اچھی، پرستائش ناتمام عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
 جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل تم پہ اے خاقانِ نام آور! کھلا

تم کرو صاحبِ قرانی، جب تک
 ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

مثنوی در صفِ انبہ

ہاں دل درد مندِ زمزمہ ساز
 خامہ کا صفحے پر رواں ہونا
 مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے؟
 بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
 آدم کا کون مردِ میداں ہے؟
 تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں!
 آم کے آگے پیش جاوے خاک
 نہ چلا جب کسی طرح مقذور
 یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
 مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے!
 نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
 اور دوڑائیے قیاس کہاں!
 جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
 کیوں نہ کھولے درِ خزنیہ راز!
 شاخِ گل کا ہے گلستاں ہونا
 نکتہ ہائے خرد فرا لکھیے
 خامہ، نخلِ رطب فشاں ہو جائے
 ثمر و شاخ، گوے چوگاں ہے
 آئے، یہ گوئے اور یہ میداں
 پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
 بادۂ ناب بن گیا انگور
 شرم سے پانی پانی ہونا ہے
 آم کے آگے عیشکر کیا ہے
 جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
 جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں!
 کوہکن باوجودِ غمگینی

ق

جان دینے میں اس کو یکتا جان
 نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
 پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
 کہ دواخانہ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قد کا ہے توام
پا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
انگبوں کے بحکمِ ربِّ الناس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
شب ہوا ہے ثمرِ فشاں یہ نخل
تھا ثرنجِ زر ایک خسرو پاس
آم کو دیکھتا، اگر اک بار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
رہرو راہِ خلد کا توشہ
صاحبِ شاخِ برگ و بار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
وہ کہ ہے والی ولایتِ عہد
فخر دین، عزّ شان و جاہِ جلال
کار فرمائے دین و دولت و بخت
سایہ اُس کا، ہما کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور
اس خُداوندِ بندہ پرور کو
شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
باغبانوں نے باغِ جنت ہے
بھر کے بھیجے ہیں سرِ بمبرِ گلاس
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
رنگ کا زرد، پر کہاں مویں باس
پھینک دیتا طلاے دست افشار
نازشِ دودمانِ آب و ہوا
طوبی و سدہ کا جگر گوشہ
ناز پروردہ بہار ہے، آم
نوبِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
زینتِ طینت و جمالِ کمال
چہرہ آراے تاج و مسند و تخت
خلق پر وہ خُدا کا سایہ ہے
جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دلشاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

قطعات



اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر!
 اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل!
 پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ
 فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادتِ اکیل
 تیرا اندازِ سخنِ شانہ زلفِ الہام
 تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل
 تجھ سے عالم پہ گھلا، رابطہٴ قربِ کلیم
 تجھ سے دنیا میں بچھا مادہٴ بذلِ خلیل
 بہ سخن، اوجِ وہ مرتبہٴ معنی و لفظ
 بہ کرم داغِ نہِ ناصیہٴ قلزم و نیل
 تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
 تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
 ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
 زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
 تیری بخشش، مری انجامِ مقاصد کی کفیل
 تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید
 تیرا اندازِ تغافل، مرے مرنے کی دلیل
 بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں
 چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
 پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتہٴ اوقات میں گانٹھ
 پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناحنِ تدبیر میں کیل
 تپشِ دل، نہیں بے رابطہٴ خوفِ عظیم
 کششِ دم، نہیں بے ضابطہٴ جرِ ثقیل
 دُرِ معنی سے مرا صفحہٴ لقا کی داڑھی
 غمِ گیتی سے مرا سینہٴ عمر کی زنبیل
 فکرِ میری، گہر اندوزِ اشارتِ کثیر
 کلکِ میری، رقمِ آموزِ عباراتِ قلیل
 میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح
 میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل
 نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
 جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
 قبلہٴ کون و مکاں! بختہٴ نوازی میں یہ دیر!
 کعبہٴ امن و اماں! عقدہٴ کشائی میں یہ ڈھیل!

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
 کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
 بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
 قسم لو ہم سے، گر یہ بھی کہیں، کیوں ہم نہ کہتے تھے؟

قطعہ

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
 اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہاے ہاے!
 وہ سبز زار ہاے مطرا کہ ہے غضب
 وہ نازنیں بجانِ خود آرا کہ ہاے ہاے
 صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ ہف نظر!
 طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہاے ہاے
 وہ میوہ ہاے تازہ شیریں کہ واہ واہ
 وہ بادہ ہاے تابِ گوارا کہ ہاے ہاے!

درمدحِ ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
 زیب دیتا ہے، اسے جس قدر اچھا کہیے
 خامہ انگشتِ بدنِداں کہ اے کیا کہیے!
 ناطقہ سر بہ گریباں کہ اے کیا کہیے!
 مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
 حرزِ بازوے شکرِ فانِ خود آرا کہیے
 مستیِ آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھیے
 داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
 خاتمِ دستِ سلیمان کے مشابہ لکھیے
 سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے
 اخترِ سوختہ قیس سے نسبت دیجئے
 حالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلہ کہیے
 حجرِ الاسودِ دیوارِ حرم کیجئے فرض
 نافہ آہوے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاتی
 رنگ میں سبزہ نوخیز مسجا کہیے
 صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز
 مید کے میں اسے نشتِ خمِ صہبا کہیے
 کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟
 کیوں اسے نقطہٴ پدِ کارِ تمنا کہیے؟
 کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجئے؟
 کیوں اسے مردمکِ دیدہٴ عنقا کہیے؟
 کیوں اسے تلمہٴ پیراہنِ لیلیا لکھیے؟
 کیوں اسے نقشِ پے ناۃٴ سلما کہیے
 بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض
 اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

قطعہ

نہ پوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے
 مجھے جو بھیجی ہے بسن کی روغنی روٹی
 نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
 جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسی روٹی

بیانِ مصتف

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سہہ گری
کچھ شاعری، ذریعہٴ عزت نہیں مجھے

آزادہ رد ہوں، اور مرا مسلک ہے صلحِ گل
ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہہ سے ہو مجھے۔ پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون، اور ریختے، ہاں اس سے مدعا
جو انبساطِ خاطرِ حجرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے، سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

رُوے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُویاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ، شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبِ خداگواہ
کہتا ہوں سچ کہ، جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرتُ الملک بہادر! مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ، گرجی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خشگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سر دست
نسبتِ اکِ گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے تو سنِ دولت کی عنایاں!
یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرفِ خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زہار
غالبِ خاک نشیں، اہلِ خرابات سے ہے



ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر، چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مُشک بو کی ناند

جو آئے، جام بھر کے پیے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرنے پھولوں کو جائے پھاند

غالب! یہ کیا بیاں ہے، بجز مدح بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھ کوئی نوشت خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زری مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

درمدحِ شاہ

اے شاہِ جہاں گیرِ جہاں بخشِ جہاندار!
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدہٴ دُشوار کہ کوشش سے نہ واہو
تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے، کرے خضرِ سکندر سے ترا ذکر!
گر لب کو نہ دے چشمہٴ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیمان جو کزے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا، فرمانِ الہی
ہے داغِ غلامی ترا، توقعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرنے طاقت سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے، تابِ شرارت

ڈھونڈھے نہ ملے موجہ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دُعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری، میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگی صنعتِ حق اہل بصارت

تجھ کو شرفِ مہر بہانتابِ مبارک
غالب کو ترے عہدِ عالی کی زیارت

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ، اگر دستگاہ ہو
 اُس شخص کو ضرور ہے، روزہ رکھا کرے
 جس پاس روزہ کھول کے، کھانے کو کچھ نہ ہو
 روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارشِ مصطفیٰ بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ! اے جہاندارِ آفتابِ آثار!
 تھامیں اک بے نوائے گوشہ نشین تھامیں اک درد مندِ سینہ فگار
 تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی کہ ہوا مجھ سا ذرہ نا چیز
 گرچہ از روئے ننگ بے ہنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
 کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
 خانہ زاد اور مرید اور مداح بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
 نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں مدعا سے ضروری الاظہار
 تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار نسبتیں ہو گئیں شخص چار
 تھامیں اک درد مندِ سینہ فگار تھامیں اک درد مندِ سینہ فگار

پیر و مرشد! اگرچہ مجھ کو نہیں
 کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
 کیوں نہ در کار ہو مجھ پوشش
 کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
 رات کو آگ اور دن کو دھوپ
 آگ تاپے کہاں تلک انساں!
 دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
 میری تنخواہ جو مقرر ہے
 رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک
 مجھ کو دیکھو تو ہوں بھیدِ حیات
 بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
 میری تنخواہ میں تہائی کا
 آج مجھ سا نہیں زمانے میں
 رزم کی داستان گر سنیے
 بزم کا التزام گر کیجئے
 ظلم ہے، گرنہ دو سخن کی داد
 آپ کا بندہ اور پھروں ننگا!
 میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ
 ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام
 تم سلامت رہو ہزار برس

ذوقِ آرایشِ سر و دستار
 تانہ دے بادِ زمہریہ آزار
 جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
 کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
 بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار!
 دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار!
 وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّارِ
 اُس کے ملنے کا ہے عجب نہجار
 خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
 اور چھما ہی ہو سال میں دوبار
 اور رہتی ہے سُود کی تکرار
 ہو گیا ہے شریک ساہوکار
 شاعرِ نغزِ گوے خوش گفتار
 ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
 ہے قلم میری، ابرِ گوہر بار
 قہر ہے، گر کرو نہ مجھ کو پیار
 آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار!
 تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
 شاعری سے نہیں مجھے سروکار
 ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار



یہ گلیم ہوں، لازم ہے میرا نام نہ لے
 جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
 ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
 کہ جو شریک ہوا میرا، شریکِ غالب ہے



سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
 مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضرِ دن ہوئے
 تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
 تین مسہل، تین تمبریدیں، یہ سب گئے دن ہوئے؟



بختہ انجمنِ طوے میرزا جعفر
 کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی مخلوظ
 ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب!
 نہ کیوں ہو مادہ سالِ عیسوی ”مخلوظ“

۱۸۵۳ء



ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
 ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
 کہا غالب سے تاریخِ اس کی کیا ہے؟
 تو بولا ”اِشْرَاحِ جِشَنِ جَمِشِدِ“

۱۲۷۰ھ



گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں
 دربارِ دارِ لوگ بہم آشنا نہیں
 کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
 اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رباعیات



بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال
ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سواہِ اقلیمِ عدم
اے عمرِ گزشتہ! یک قدم استقبال



شب زلف و رُخِ عَرَقِ فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تک
ہر قطرہ اشک، دیدہ پر غم تھا



آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال
 ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
 تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
 لڑکوں کے لئے گیا ہے کھیل نکال!



دل تھا کہ جو جانِ وردِ تمہید سہی
 بیتابیِ رشک و حسرت دید سہی
 ہم اور فردن، اے تجلی، افسوس!
 تکرارِ روا نہیں، تو تجدید سہی



ہے خلقِ حسدِ قماش لڑنے کے لئے
 وحشتِ کدہ تلاش لڑنے کے لئے
 یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد
 ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے



دل سخت بوند ہو گیا ہے گویا
 اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
 پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
 غالب! منہ بند ہو گیا ہے گویا



دُکھ، جی کے پسند ہو گیا ہے غالب!
 دل رُک رُک کے بند ہو گیا ہے غالب!
 واللہ کے شب کو نیند آتی ہی نہیں
 سونا سوگند ہو گیا ہے غالب!



مشکل ہے زبں کلام میرا! اے دل!
 سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
 آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
 گویم مشکل، وگر نہ گویم مشکل!



بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ حجابہ نے دال
 ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
 یہ شاہِ پسند دال، بے بحث و جدال
 ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال



ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
 آثارِ جلالی و جمالی باہم
 ہوں شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم!
 ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم



حق، شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے
 تا شاہِ شیوعِ دانش و داد کرے
 یہ دی جو گئی ہے رشتہٴ عمر میں گانٹھ
 ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے



اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا!
 اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا!
 ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں
 ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا!



کہتے ہیں کہ، اب وہ مردم آزار نہیں
 عشاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
 جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
 کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں



ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
 کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
 کہتے ہیں، کہیں خُدا سے، اللہ اللہ!
 وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے



سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟
 آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
 روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن
 سخنانہ و برفاب کہاں سے لاؤں!



ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے!
 بھیجے ہیں جو ارمغانِ شہہ والانے
 گن کر دیوینگے ہم دُعائیں سو بار
 فیروزے کی تسبیح کے، ہیں یہ دانے

ضمیمہ



دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
 وضع میں گو ہوئی دوسر، تیغ ہے ذوالفقار ایک
 ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم و طپال
 ایک طپس کا جانشین، درد کا یادگار ایک
 نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیار آگہی
 شعر کے فن کے واسطے، مایہ اعتبار ایک
 ایک وفا و مہر میں، تازگی بساطِ دہر
 لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک
 گلکدہ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بو
 ریختہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک
 مملکتِ کمال میں، ایک امیر نامور
 عرصہ قیل و قال میں، خسرو نامدار ایک

قاسم: اس سے ابوالقاسم خان قاسم مراد ہیں۔

طپال: مرزا احمد بیگ طپال مراد ہیں۔

ان دونوں سے کلکتہ کے سفر کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
 مے کدہٴ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک
 زندہ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
 کشتہٴ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک
 دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسولؐ پر فدا
 ایک محبتِ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک
 جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
 فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ نگرگ بار ایک
 لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شایبہٴ ریا سے دور
 کر کے دل و زبان کو غالبِ خاکسار ایک

الناظر (لکھنؤ) دسمبر ۱۹۳۳ء؛ متفرقات غالب: ۱۰۶.۱.۵



اپنا احوالِ دل زار، کہوں یا نہ کہوں!
 ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں!
 نہیں کرنے کا میں تقریر، ادب سے باہر
 میں بھی ہوں واقفِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں!
 شکوہ سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو؟
 اپن ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں!
 اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریؑ دل
 جب نہ پاؤں کوئی غمخوار، کہوں یا نہ کہوں؟
 دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمن جانی اپناؑ
 ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟
 میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غماز
 گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟
 آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسد!
 حسبِ حال اپنے پھر اشعار، کہوں یا نہ کہوں؟

۱: محرم، ۲: شکر جو سمجھو اسے یا کوئی روایت سمجھو، ۳: عزاداری،
 ۴: میرا۔ ۵: گلستہ نازنیناں، ص ۲۱۳؛ دیوانِ معروف ۱۶۱-۱۶۲
 (متن ”دیوانِ معروف“ سے لیا گیا ہے اور اختلافات ”گلستہ نازنیناں“
 مؤلفہ مولوی کریم الدین (مطبوعہ ۱۸۳۵) پر مبنی ہیں۔



ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
 میں دشتِ غم میں، آہوے صیاد دیدہ ہوں
 ہوں درد مند، جبر ہو یا اختیا ہو
 گہ نالہ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں
 جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
 از بسکہ، تلخیِ غم ہجراں چشیدہ ہوں
 نے سچے سے علاقہ، نہ ساغر سے رابطہ ۱
 میں معرضِ مثال میں، دستِ مُریدہ ہوں
 ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
 نہ ۲ دانہ فقادہ ہوں، نہ ۳ دام چیدہ ہوں
 جو چاہیے ۴، نہیں وہ مری قدر و منزلت
 میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں
 ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
 ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں
 اہلِ ورع کے حلقے ۵ میں ہر چند ہوں ذلیل
 پر عاصیوں کے فرقہ ۶ میں، میں برگزیدہ ہوں
 پانی سے سگ گزیدہ ڈر سے جس طرح اسد!
 ڈرتا ہوں آئینے ۷ سے، کہ مر دم گزیدہ ہوں کے

۱: واسطہ، ۲: نے، ۳: چاہتے، ۴: حلقے، ۵: زمرے، ۶: آئینہ
 ۷: بیاض علاء الدین احمد خاں علانی (قلمی) (رضالا بھری راپور)۔



مجلس شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامنِ صبا جاتا ہوں

ہووے ہے جادۂ رہ، رشتہ گوہر ہر گام
جس گذر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سُبک رَو کے نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبش لب مثلِ صدا جاتا ہوں!

ن: عمدۂ منتخبہ (قلمی) ۹۲



شب وصال میں، مونس گیا ہے بن تکیہ
 خراج بادشہ چھیں سے کیوں نہ مانگوں آج!
 بنا ہے تختہ و گل ہاے یا سمیں بستر
 فروغ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
 مزا ملے، کہو کیا خاک، ساتھ سونے کا
 اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر
 ہوا ہے کاٹ کے چادر کونا کہاں غائب
 بضر ب تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
 یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہوتے تک
 اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن
 غش آگیا جو پس از قتل، میرے قاتل کو
 شب فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
 روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ ”تکیہ کلام“

اب اس کو کہتے ہیں اہل سخن، ”سخن تکیہ“

ہم اور تم، ”فلک پیر“ جس کو کہتے ہیں
 فقیر غالب مسکین کا ہے کہن تکیہ



میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
 تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی
 غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ!
 ہیں ہوسِ پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی
 تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
 تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
 حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
 آپ کا شیوہ و انداز و ادا، اور سہی
 تیرے کوچہ کا ہے مائلِ دلِ مضطر میرا
 کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
 کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!
 خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
 کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب!
 سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
 مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
 زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی
 مجھ سے، غالب! یہ علائی نے غزل لکھوائی
 ایک بیداد گر رنجِ فزا اور سہی



کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ، کہ وہ زلفِ خمِ نخم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالع مولود
کسے خبر ہے کہ، وہاں جنبشِ قلم کیا ہے؟

نہ خشر و نشر کا قائل نہ کیش و مانت کا
خدا کے واسطے! ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے، ہدم
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے؟



آپ نے مَسْنِي الضُّرِّ، کہا ہے تو سہی
یہ بھی یا حضرتِ ایوبؑ، گلا ہے تو سہی

رنجِ طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیوں سر
ذہن میں، خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت، کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست گر کوئی نہیں ہے، جو کرے چارہ گری
نہ سہی، ایک تمناے دوا ہے تو سہی

غیر سے، دیکھیے، کیا خوب نبھائی اُس نے!
نہ سہی ہم سے، پد اُس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اُسے نامہ اعمال میں، میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالب!
شہرہ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی



لطفِ نظارہ قاتل، دمِ بسمل آئے
جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم کہ، کشی پہ مری کیا گزری!
دوست جو ساتھ مرے تائبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ!
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اُٹھتے ہیں
”لو، وہ برہم زنِ ہنگامہ محفل آئے“

دیدہ خونبار ہے مدت سے، ولے آج ندیم!
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے، نہ کیا ہے، نہ کریں
عکس تیرا ہی، مگر، تیرے مقابل آئے

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا، غالب!
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی میل آئے



دیکھ وہ برقی تبسم بسکہ دل بیتاب ہے
 دیدہ گریاں مرا، فوارہٴ سیماب ہے
 کھول کر دروازہٴ میخانہ، بولا مے فروش
 ”اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے“



ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
 رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے
 پروانہ کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے، اسدا!
 ہر رات شمعِ شام سے لے تا سحر جلے



ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرے ستم نکلے
 جو وہ نکلے، تو دل نکلے، جو دل نکلے، تو دم نکلے

خمسہ برغزل

بہادر شاہ ظفر

گھستے گھستے پانوں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
”کھنچ کے قاتل! جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے، جانِ عاشقِ دلگیر، آدھی رہ گئی“

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پُرم، اُس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے روبرو
بات کرنے میں، نکلتا ہے دم اُس کے روبرو
”کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو
ہم نشیں! آدھی ہوئی تقدیر آدھی رہ گئی“

تو نے دیکھا، مجھ پہ کیسی بن گئی، اے رازدار!
خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار!
مثلِ زخمِ آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار

”کھینچتا تھا‘ رات کو، میں خواب میں، تصویرِ یار
جاگ اٹھا، جو کھینچنی تصویرِ آدھی رہ گئی“

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں اے دلنواز!
مستیِ چشمِ سیہ سے چل کے ہوویں چارہ ساز
تو صدائے پا سے جاگا تھا جو، محوِ خوابِ ناز!
”دیکھتے ہی، اے ستمگر! تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیرِ آدھی رہ گئی“

اُس بُتِ مغرور کو کیا ہو سکی پر التفات!
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنا ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ گذری ہوگی راتیں پان سات
”اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشیدِ پُر تنویرِ آدھی رہ گئی“

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں
ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و اَلَم، گھاٹا ہے ہر ایک بات میں
”کم نصیبی اس کو کہتے ہیں، کہ میرے ہات میں
آتے ہی، خاصیت، اکسیرِ آدھی رہ گئی“

سب سے یہ گوشہ کنارے ہے، گلے لگ جا مرے
 آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جا مرے
 سرے گر چادر اُتارے ہے، گلے لگ جا مرے
 ”مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جا مرے
 وصل کی شب، اے بُتِ بے پیر آدھی رہ گئی“

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے
 پر نصیب اپنا، انہیں جاتا سنا، جوں پھر گئے
 دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے
 ”آگے آدھی دُور میرے گھر سے، وہ کیوں پھر گئے؟
 کیا کشش میں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی؟“

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو یارب! کب کی تاب
 کچھ نہیں کہتا کسی سے سُن رہا ہوں سب کی بات
 کس لئے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ پرسوں شب کی بات!
 ”نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
 خط میں آدھی ہو سکی تحریرِ آدھی رہ گئی“

ہو تجلی برق کی صورت میں ہے یہ بھی غضب
ہاں چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب
”پاس میرے وہ جو آئے بھی، تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر! آدھی رہ گئی“

تم جو فرماتے ہو، دیکھ، اے غالب آشفۃ سر!
ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، کیا کیوں اُس کے گھر؟
جان کی پاؤں اماں باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر
”دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفر
وہاں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی“

قصیدہ

ملا ذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سیاہ
 جنابِ عالی ایلن بردنِ والا جاہ
 بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
 کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ نگاہ
 وہ محض رحمت و رافت، کہ بہر اہل جہاں
 نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ
 وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پُرسش کی
 بنے ہے، شعلہٴ آتش، انیسِ پڑۂ کاہ
 زمیں سے سُودۂ گوہر اُٹھے، بجائے غبار
 جہاں ہو تو سنِ حشمت کا اُس کے جولا نگاہ
 وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں: ”الہی، شکر“
 وہ خشکیں ہو، تو گردوں کہے: ”خدا کی پناہ“

ق

یہ اُس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش
 کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہ ہر سرِ راہ
 ہر بز، پنچے سے، لیتا ہے کام شانے کا
 کبھی جو ہوتی ہے اُبجھی ہوئی دُمِ روباہ
 نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
 نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسر شاہ
 خدا نے اُس کو دیا ایک خوبرو فرزند
 ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوے ماہ
 زہے، ستارہ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
 شعاعِ مہرِ درخشاں ہو، اُس کا تارِ نگاہ
 خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
 پینگا شرق سے تاغرب اس کا بزیگاہ
 جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی
 کہ تابع اس کے ہوں روز و شبِ سپید و سیاہ
 کہے گی خلق اسے ”داورِ سہرِ شکوہ“
 لکھیں گے لوگ اسے ”خسرو ستارہ سیا“
 عطا کرے گا خداوندِ کار ساز اسے
 روانِ روشن و نُوے خوش و دل آگاہ

ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں، کہ اسے
 پڑے نہ قطعِ خصومت میں، احتیاجِ گواہ
 یہ ٹرکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس
 یہ لے گا، بادِ شرہ چیس سے، چھین تخت و گواہ
 سنینِ عیسوی، اٹھارہ سو اور اٹھاون
 یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
 یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں
 دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ
 اُمیدوارِ عنایات، ”شیوہ نارائن“
 کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
 یہ چاہتا ہے کہ دُنیا میں عز و جاہ کے ساتھ
 تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ!

قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تا بروزِ شمار
یقین جان، برس گانٹھ کا ہے جوتا گا
گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ پڑے!
دکھا کے رشتہ کسی جوتی سے پوچھا تھا
کہا، کہ ”چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نوگرہ ہیں
خود آسماں ہے مہاراوِ راجا پر صدقے
وہ راوِ راجہ بہادر، کہ حکم سے جن کے
انہیں کی سالگرہ کے لئے ہے سال بسال
انہیں کی سالگرہ کے لئے بناتا ہے
انہیں کی سالگرہ کے لئے ہے یہ توقیر
سُن اے ندیم! برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
پے دُعاے بقاے جنابِ فیض مآب
ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی
عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اُس کو

ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ
ہوا کریگی ہر اک سال، پیش کار گرہ
یہ کہکشاں ہے، کہ ہیں اس میں بیشمار گرہ
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ
کہ ”دیکھ کتنی اٹھالائے گا یہ تار گرہ؟“
جو یاں گنینگے تو پاویں گے نو ہزار گرہ“
کرے گا سینکڑوں، اس تار پر شمار گرہ
رواں ہوتا رہے فی الفور، دانہ وار، گرہ
کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نو بہار گرہ
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ باز، گرہ
کہ بن گئے ہیں، ثمر ہائے شاخسار، گرہ
تجھے بتاؤں، کہ کیوں کی ہے، اختیار گرہ
لگے گی اس میں ثوابت کی استوار گرہ
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ

بچے نہ از پے بندِ نقاب یارِ گرہ
 کہ جادہ رشتہ ہے، اور ہے شتر قطارِ گرہ
 کروڑ ڈھونڈ کے لاتا یہ خاکسارِ گرہ
 پڑی ہے، دل میں مرے، غم کی پیچدارِ گرہ
 زباں تک آ کے ہوئی اور اُستوارِ گرہ
 بُری طرح سے ہوئی اور اُستوارِ گرہ
 کبھی کسی سے کھلے گی نہ زینہارِ گرہ
 پڑی ہے، یہ جو بہت سخت نابکارِ گرہ

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں، جب اُس زمانے میں
 متاعِ عیش کا، ہے قافلہ چلا آتا
 خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگاہِ سخن
 کہاں مجالِ سخن، سانس لے نہیں سکتا
 گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
 کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے
 ادھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جب تک
 دعا ہے یہ کہ، مخالف کے دل میں، از رہِ بغض

دل اُس کا پھوڑ کے نکلے، بشکل پھوڑے کی
 خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھارِ گر

قصیدہ

کرتا ہے چرخِ روزِ بصد گونہ احترام
 حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
 جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم
 جس بزم میں کہ ہوا نہیں آئینِ میکشی
 چاہا تھا میں نے تم کو مہ چارودہ کہوں
 دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
 سچ ہے، تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے
 میری سنو، کہ آج تم اس سر زمین پر
 اخبارِ لودھیانہ میں، میری نظر پڑی
 ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحریر کو جگر
 وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
 سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
 ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جانگداز
 تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
 اُس بزمِ ہر فروغ میں اس تیرہ بخت کو
 فرماں رواے کشورِ پنجاب کو سلام
 نوابِ مستطاب، امیر شہ احتشام
 ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لینِ حُسام
 واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام
 دل نے کہا، کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
 حضرت کا عَزَّ و جَاہ رہے گا علی الدوام
 دریاے نور ہے فلکِ آگینہ فام
 حق کے تَفْضُّلات سے ہو مرجعِ انام
 تحریر ایک، جس سے ہوا بندہ، تلخ کام
 کاتب کی آستیں ہے، مگر تیغِ بے نیام
 جب یاد آگئی ہے، کلجا لیا ہے تھام
 لمبر رہا، نہ نذر نہ خلعت کا انتظام
 جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
 استاد ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
 لمبر ملا نشست میں از روے اہتمام

دربار میں جو مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام
 عزت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی نہ نام
 اُس ناز کا، فلک نے لیا، مجھ سے انتقام
 تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اثر دہام
 آقا سے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
 دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام
 سلطانِ بحر کے درکا، ہوں میں غلام
 شاہانِ عصر چاہیے، لیں عزت اس سے وام
 بیوجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام
 بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے قیام
 چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام
 یعنی دعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل
 عزت پہ اہل نام کی ہستی کی ہے بنا
 تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
 آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
 اس کش مکش میں آپ کا مداحِ درد مند
 جو داں نہ کہہ سکا تھا، وہ لکھا حضور کو
 ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
 وکٹوریہ کا دہر میں جو مدحِ خوان ہو
 خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
 امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال
 ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو
 دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے

ہے یہ دُعا، کہ زیرِ رنگیں آپ کے رہے
 اقلیمِ ہند و ہند سے تا ملکِ روم و شام

قصیدہ

مرحبا! سالِ فرخی آئیں
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار
گرچہ ہے بعدِ عید کے نوروز
سو اس اکیس دن میں ہولی کی
شہر میں گوبکو، عبیر و گلال
شہر، گویا، نمونہ گلزار
تین تیوہار، اور ایسے خوب
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں
محفلی غسلِ صحتِ نواب
بزمگہ میں، امیرِ شاہ نشاں
پیشگاہِ حضورِ شوکت و جاہ
جن کی مسند کا آسمان گوشہ
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور
انجمنیں چرخ، گوہر آگیں فرش
راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے
وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال
واں کہا یہ عطا و بدل وہ کرم!

عیدِ شوال و ماہِ فرورِ دیں
مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں
جا بجا مجلسیں ہوئی رنگیں
باغ میں سو سو، گل و نسریں
باغ، گویا، نگار خانہ چیں
جمع ہر گز ہوئے نہ ہونگے کہیں
منعقد، محفلِ نشاطِ قریں
رونق افزائے مسدِ تمکین
بزمگہ میں، حریفِ شیر کمین
خیر خواہِ جناب، دولت و دیں
جن کی خاتم کا آفتابِ نگین
آسماں ہے گداے سایہ نشین
نہ ہوئی ہو کبھی بروے زمیں
نورِ مے، ماہِ ساغرِ سمیں
ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقین
کہ جہاں گد یہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے
 نغمہِ مطربانِ زہرہ نوا
 اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون
 سرورِ مہر فر ہوا جو سوار
 سب نے جانا، کہ ہے پری تو سن
 نقشِ سُمِ سمند سے ہکسیر
 فوج کی گردِ راہ، مُشکِ فشاں
 بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت
 موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا
 ژالہ آسا بچھے ہیں دُرّ شمس
 جلوۂ لولیانِ ماہِ جبیں
 یاں وہ دیکھا پشمِ صورت میں
 بکمالِ تجمل و تزیین
 اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
 بن گیا دشت، دامنِ گلچیں
 رہروں کے مشام، عطر آگیں
 فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
 جس طرح ہے سپہر پر پرویں

ق

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
 اور داغِ آپ کی غلامی کا
 بندہ پرور! ثنا طرازی ہے
 آپ کی مدح، اور میرا منہ!
 اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے
 پیری و نیستی، خدا کی پناہ!
 صرف اظہار ہے، ارادت کا
 مدح گستر نہیں، دعا گو ہے
 ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں
 خاص بہرام کا ہے زیپِ سُرین
 مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
 گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقین!
 ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
 دستِ خالی و خاطرِ غمگین
 ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں
 غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
 ہے دُعا بھی یہی، کہ دنیا میں
 تم رہو زندہ جاوداں! آمیں!

مثنوی

ایک دن، مثلِ پتنگِ کاغذی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا
میں کہا: ”اے دل! ہواے دلبراں
”پیچ میں اُن کے نہ آنا زنیہار
”گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر
”اب تو مل جائے گی تیری اُن سے سانٹھ
”سخت مشکل ہو گا، سلجھانا تجھے
”یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے
”ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر، کانپ کر کھا پیچ و تاب

لے کے دل سرِ رشتہ آزادگی
اس قدر بگڑا، کہ سر کھانے لگا
بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں“
یہ نہیں رہیں گے کسو کے یارِ غار“
کھینچ لیتی ہیں یہ ڈورے ڈال کر“
لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ“
تہر ہے دل ان میں الجھانا، تجھے“
بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے“
مُفت میں ناحق کٹا دیں گے تمہیں“
غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتہ در گردِ نم افگندہ دوست

می بزد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

قطعات

قطعه

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطّہ خاک!
 کہاں ہے ساقیِ مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر؟
 خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
 ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک، وہ کہے
 فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
 جنابِ قبلہ حاجات! اس بلاکش نے
 رہا ہے زور سے ابر ستارہ بار برس
 بیار، لا، مے گلنار گوں؛ بہار برس
 درِ حضور پر اے ابر! بار بار برس
 ”امیرِ کلپ علی خاں جبیں ہزار برس“
 کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس
 بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات

خدا کرے، کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

قطعہ

ہند میں اہلِ تَسَن کی ہیں دو سلطنتیں
 حیدر آبادِ دکن، رشکِ گلستانِ اِرم
 رام پور، اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
 کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم
 حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ
 اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم
 رام پور آج ہے وہ بقعہٴ معمور، کہ ہے
 مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
 رام پور، ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال
 دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خورم
 جس طرح باغ میں سانوں کی گھٹائیں برسیں
 ہے اسی طور پر یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
 ابرِ دستِ کرمِ کلپِ علی خاں سے مدام

دُرِ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
 صبح دم باغم میں آجائے، جسے ہو نہ یقین
 سبزہ و ہلک گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
 حَبْذَا باغِ ہمایونِ تقدسِ آثار!

کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
 مسلکِ شرح کئے ہیں راہرو و را شناس
 خضر بھی یہاں اگر آجائے، تولے ان کے قدم
 مدح کے بعد دُعا چاہیے، اور اہلِ سخن
 اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم
 حق سے کیا مانگیے، اُن کے لیے جب ہو موجود
 مُلک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
 ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
 دو دُعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
 یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
 دو وہ چیزیں، کہ طلبگار ہے جن کا عالم
 اولاً عمرِ طبعی، بہ دوامِ اقبال
 ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

قطعہ تاریخِ اختتامِ کتاب

سلیم خاں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں
تمام دہر میں اس کے مطلب کا چرچا ہے
اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے
عجیب نسخہٴ نادر لکھا ہے اک اس نے
نہیں کتاب ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع
کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے
حکیم حازق و دانا ہے وہ لطیف کلام
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
ہوئی ہے مبدِ عالم سے اس قدر انعام
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
کہ جس میں حکمتِ طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب ہے اک معدنِ جواہر کام
کمالِ فکر میں دیکھا، خرد نے بے آرام

کہا یہ جلد، کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے
”لکھا ہے نسخہٴ تحفہ“ یہی ہے سالِ تمام



اے جہان آفریں، خداے کرم!
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور
صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم
یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شادمان رہیں
اور غالب پہ مہربان رہیں

قطعہ

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت، وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سویہ نظرِ فروزِ قلمدانِ نذر ہے
مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

سہرا

خوش ہو، اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے!
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ گلاہ!
مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے تیرا لبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پردے گئے ہونگے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گمہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی، کہ قبا سے بڑھ جائے
 رہ گیا، آن کے دامن کے برابر، سہرا
 جی میں اترائیں نہ موتی، کہ ہمیں ہیں اک چیز
 چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر، سہرا
 جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
 گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا!
 رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک
 کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر، سہرا
 تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابر بہار
 لائے گا تابِ گراں باری گوہر، سہرا
 ہم سخنِ فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں
 دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں
 بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
 ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
 ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

سہرا

چرخ تک دُھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا
ریشک سے لڑتی ہیں، آپس میں اُلجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لئے جب سر یہ اٹھایا سہرا

قطعہ تاریخ

اس کتاب طرب نصاب نے جب
فکرِ تاریخ سال میں، مجھ کو
ہند سے پہلے سات سات کے دو
اور پھر "ہندسہ تھا بارہ کا
سال ہجری تو ہو گیا معلوم
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ
غرض اس سے ہیں چارہ معصوم
اور بارہ امام ہیں بارہ
اُن کو غالب یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولائی

آب و تاب انطباع کی پائی
ایک صورت نئی نظر آئی
دیے ناگاہ مجھ کو دکھلائی
با ہزاراں ہزار زیبائی
بے شمول عبارت آرائی
ہے جداگانہ کار فرمائی
بہ امید سعادت افزائی
جس سے ہے چشمِ جان کو زیبائی
جس سے ایماں کو ہے توانائی

خط منظوم بنامِ علائی

بس کہ فَعَالِ مَایْرِیْدِ ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنہ خوں ہے، ہر مُسلمان کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا، کہ مل گئے، پھر کیا؟ وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دید ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے، یارب!
کیا مٹے داغ و دل سے ہجراں کا

خط منظوم بنامِ علائی

خوشی ہے یہ، آنے کی برسات کے ہمیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم کہ دلی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکمِ باورِ چیوں کو، کہ ہاں! ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں اہلی کی پھول وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں

فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار

کہو، اس کو کیا، کھا کے ہم خط اٹھائیں

قطعہ

اے منشی خیرہ سر! سخن ساز نہ ہو
عصفور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی، اور آواز کے ساتھ
لاٹھی وہ لگی، کہ جس میں آواز نہ ہو

قطعہ

کیا، ان دنوں بسر ہو، ہماری فراغ میں
کچھ تفرقہ رہا، نہ دل و درد و داغ میں
چاہا پچشمِ شوق، جو موسیٰ نے طور پر
یہاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں
یہ مکت و وقار، علائی! یہ حشمتیں
شورش ہے کچھ ضرور، تمہارے دماغ میں

مرثیہ

ہاں، اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو
اے زمزمہ قم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے دجلہ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے ماتمیانِ شہِ معصوم! کہاں ہو
بگڑی ہے بہت، بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی
تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہ نہ جو مدت سے بجا ہے
کیا خیمہ شہیر سے رتبہ میں سوا ہے!

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کیسا فلک اور مہر جہانتاب کہاں کا!

کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
ہو گا دل بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
نہ بادشاہ نہ سُلطان یہ کیا ستائش ہے
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
خدا کا بندہ، خداوند گار بندوں کا
فروغِ جوہرِ اماں، حسینؑ ابنِ علیؑ
کفیلِ بخششِ اُمت ہے بن نہیں پڑتی
مسحِ جس سے کرے اخذ فیض جاں بخشی
وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیلِ سبیل
عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
ہمارے درد کی یارب! کہیں دوا نہ ملے
ہمارا منہ ہے کہ دیں اُس کے حُسنِ صبر کو داد!

تو پھر کہیں کہ پھر اس سے سوا کہیں اُس کو
کہو، کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اُس کو
کہو، کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اُس کو
اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اُس کو؟
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اُس کو
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو
کہ جن و انس و ملک سب بجا کہیں اُس کو
بقدرِ فہم ہے، گر کیا کہیں اُس کو
کہ نوکِ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اُس کو
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اُس کو

زمامِ ناقہ کف اُس کے میں ہے کہ اہلِ یقین
 وہ ریگِ تفتہ وادی پہ گام فرسائے
 امامِ وقت کی یہ قدرت ہے کہ اہلِ عناد
 یہ اجتہادِ عجب ہے کہ ایک دشمن دیں
 یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
 علیؑ کے بعد حسنؑ کے بعد حسینؑ
 نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے
 پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اُس کو
 کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اُس کو
 پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو
 علیؑ سے آ کے لڑنے اور خطا کہیں اُس کو
 بُرا نہ مانے، گر ہم بُرا کہیں اُس کو
 کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اُس کو؟
 رکھے امام سے جو بغض، کیا کہیں اُس کو

بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد
 غلط نہیں ہے، کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

رباعیات

رُقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
 حاجی کُلو کو دے کے بیوجہ جواب
 ثاقب! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
 غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

اے روشنی دیدہ شہاب الدین خاں!
 ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟
 کتنا ہے بتاؤ، کس طرح سے رمضاں؟
 سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآن؟

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
 دہری کیونکر ہو جو کہ ہودے صوفی؟
 کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
 شیعہ کیونکر ہو، ماوراء النہری؟

فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ لے حاصل
بادہ، غالب! غرقِ بید نہیں



ابر روتا ہے، کہ بزمِ طرب آمادہ کرو برق ہستی ہے، کہ فرصت کوئی دم ہے، ہم کو



بہا ہے یاں تک اشکوں میں، غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں، ہر اک پارۂ دل، پائے درگل ہے



دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ، سو آپ کا دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکالے



شمسیر صاف یار، جو زہراب دادہ ہو وہ خطِ سبز ہے، کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

○ دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زینجا مجھ کو

○ ہسنتے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے، چمن زعفران مجھے

○ جگر سے ٹوٹے ہوئے سوکی ہے سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

○ نیازِ عشق، خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق، مشیتِ خار و خس بہتر

○ یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ! غلط
کی تصور نے بہ صحراے ہوس راہ غلط

○ ماہِ نو ہوں کہ فلکِ عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

○ صبا! لگا وہ طپانچے طرف سے بلبیل کی
کہ رُوے غنچہ نکل سوے آشیاں پھر جائے

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے

ایسے ہنستے کوڑ لایا ہے کہ جی جانے ہے

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا!

مذہب نہیں ہے کوئی، ملت نہیں ہے کوئی

گلشِ دہر بھی، ہے کوئی سراے ماتم

شبِ نیم اس باغ میں جب آئے، تو گریاں آئے

دورنگیاں یہ زمانے کی، جیتے جی ہیں سب

کہ مردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

پھر مرتبہ بڑھایا مرا، نفی غیر نے

آیا ہر ایک مکان نظر، لامکاں مجھے

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی جھانک تا نک کی

روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا

وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر

آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

دمِ واپس برسرِ راہ ہے

عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

نسخہ حمیدیہ



نتیگی رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر
میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
خُورِ شبِ نیم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدا!
سرتا قدم، گزارشِ ذوقِ سجود تھا۔



ہے کہاں، تمنا کا دوسرا قدم یا رب!
بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تاگے
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پایا پایا
ایک بیکیسی، تجھ کو عالم آشنا پایا
خاکبازی اُمید، کار خانہ طفلی
یاس کو دو عالم سے، لبِ بختدہ وا پایا



شبِ نظارہ پرور تھا، خواب میں خیالِ اُس کا
صبح، موجہٴ فکل کو نقشِ بوریہ پایا



کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
ساغرِ جلوہٴ سرشار ہے ہر ذرہٴ خاک
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
شوقِ دیدار، بلا آئینہ ساماں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں، لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر، کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

○ دیدہ تادل ہے، یک آئینہ چراغاں، کس نے
مطربِ دل نے، مرے تارِ نفس سے غالب!
خلوتِ ناز پہ پیرایہ محفل باندھا؟
ساز پر رشتہ پے نغمہ بیدل باندھا

○ واں، ہجومِ نغمہ ہاے سازِ عشرت تھا اسدا!
ناحنِ غم، یاں، سرِ تارِ نفس مضراب تھا

○ اگر آسودگی ہے مدعاے رنجِ بیتابی
نثارِ گردشِ پیماۂ مے، روزگار اپنا

○ ہوائے صبح یک عالم گریباں چاکی گل ہے
دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا

○ اسدا! یہ عجز و بے سامانی فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعویٰ ہے خدائی کا

○ ہم نے وحشت کدہ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلہٴ عشق کو اپنا سرو ساماں سمجھا



نگاہِ چشمِ حاسدِ وام لے اے ذوقِ خودِ بینی! تماشائی ہوں وحدتِ خانہ آئینہ دل کا
 شرِ فرصتِ نگہِ سامانِ یک عالم چراغاں ہے بقدرِ رنگِ یاں گردش میں ہے پیانہ محفل کا
 سراسرِ تاخُن کو، ششِ جہتِ یک عرصہ جولاں تھا ہوا و اماندگی سے رہرواں کی فرق منزل کا
 مجھے راہِ خُن میں خوفِ گمراہی، نہیں غالب!
 عصاے نھرِ صحراے خُن ہے خامہ بیدل کا



بصورتِ تکلف، بمعنی تائف اسد! میں تبسم ہوں پڑ مردگاں کا



ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش، در بھی دور تھا اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
 اے وائے! غفلتِ نگہ، شوقِ ورنہ یاں ہر پارہ سنگِ لختِ دل کوہِ طور تھا
 درسِ تپش ہے برقِ کوآبِ اُس کے نام سے وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلصِ صُور تھا
 جت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر جوہرِ سوادِ جلوہ مرگانِ حور تھا
 ہر رنگ میں جلا، اسدِ فتنہ انتظار
 پروانہ تجلی شمعِ ظہور تھا

○
 خود پرستی سے رہے باہم دگر، نا آشنا
 آتش موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک
 بید ماعی شکوہ سنج رشکِ ہم دیگر نہیں
 ربطِ یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
 بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
 ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا! آشنا
 یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا
 سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ گل نا آشنا

○
 اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو، پر اسد!
 جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

○
 بت پرستی ہے بہارِ نقش بندی ہاے دہر
 کل اسد کو ہم نے دیکھا، گوشہٴ غم خانہ میں
 ہر صریرِ خامہ میں یک نالہٴ ناقوس تھا
 دست بر سر، سر بہ زانوے دلِ مایوس تھا

○
 رکھا غفلت نے دور افتادہٴ ذوقِ فنا، ورنہ
 اشارتِ فہم کو، ہر ناحنِ بیدہ، ابرو تھا



بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبِ ہا
سرِ تارِ نظر ہے رشتہٴ تسبیح کو کب ہا

کرے گر، فکرِ تعمیرِ خرابی ہاے دل، گردوں
نہ نکلے خشتِ مثلِ استخوانِ بیرونِ قالب ہا

کرے ہے، حُسنِ خوباں، پردہ میں مشاطگی اپنی
کہ ہے تہ بندیِ خط، سبزہٴ خط در تہ لب ہا

اسد کو بُت پرستی سے غرض دردِ آشنائی ہے
نہاں ہیں نالہٴ ناقوس میں در پردہ ”یارب ہا“



بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شہرت، اہتمامِ اُس کا
نگلیں میں، جوں شرارِ سنگ، ناپیدا ہے نامِ اُس کا
بہ اُمیدِ نگاہِ خاص ہوں، محملِ کشِ حسرت
مبادا ہو عنانگیرِ تغافل، لطفِ عامِ اُس کا
اسد! سوداے سرسبزی سے، ہے تسلیمِ رنگیں تر
کہ کشتِ حُشکِ اُس کا، ابرِ بے پروا خرامِ اُس کا



عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا
 آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا دل دیوانہ، کہ وارستہ ہر مذہب تھا
 شوق سامانِ فضولی ہے، وگرنہ، غالب!
 ہم میں سرمایہٴ ایجادِ تمنا کب تھا



یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا آغوشِ نقشِ پا میں کیجئے فشارِ صحرا
 وحشت اگر رسا ہے، بیجاصلی ادا ہے پیانہ ہوا ہے، مُشتِ غبارِ صحرا
 دیوانگی اسد کی، حسرت کش طرب ہے
 در سر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا



وحشی بن، صیاد نے ہم رَمخوردوں کو کیا رام کیا
 رشتہ چاکِ جیبِ دریدہ، صرفِ قماشِ دام کیا
 مہر بجائے نامہ لگائی، بر لبِ پیکِ نامہ رساں
 قاتل تمکینِ سنج نے، یوں خاموشی کا پیغام کیا
 شامِ فراقِ پار میں، جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسد!
 ماہ کو، در تسبیحِ کواکب، جائے نشینِ امام کیا



سیرِ آنسوئے تماشا ہے طلبگاروں کا خضرِ مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے، خدا خیر کرے! رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہوا داروں کا

اسد، اے ہرزہ در! نالہ بہ غوغا تا چند؟

حوصلہ تنگ نہ کر، بے سبب آزاروں کا



بوقتِ کعبہ جوئی ہا، جس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا، فصلِ گل میں، رشک ہے بت خانہ چیس کا
اسد! اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں، لیکن نہیں مشتاقِ تحسین کا



وردِ اسمِ حق سے، دیدارِ صنم حاصل ہوا رشتہٴ تسبیح، تارِ جادہٴ منزل ہوا
عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندیِ اسد! نقص پر اپنے ہوا جو مطلع، کامل ہوا



سرمنزلِ ہستی سے ہے صحراے طلبِ دور جو خط ہے کفِ پاپہ سو ہے سلسلہٴ پا



قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیج رفتارِ نہیں، بیشتر از لغزشِ پا ہیج
 حیرت ہمہ اسرارُ پہ مجبورِ خموشی ہستی نہیں جو بستنِ پیمانِ وفا ہیج
 کس بات پہ مغرور ہے؟ اے عجزِ تمنا! سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیج
 آہنگِ اسد میں نہیں جو نغمہٴ بیدل
 ”عالم ہمہ افسانہٴ ما دارد و ما ہیج“



زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسد!
 غفلتِ آرامی یاراں پہ ہیں خنداں، گل و صبح



تھی، نگہ میری، نہاںخانہ دل کی نقاب
تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیاہ

بے خبر جیتے ہیں اربابِ ریا، میرے بعد
مُتفرق ہوئے میرے رفقا، میرے بعد



ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گُل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہاںِ داد
تیغِ درکف، کفِ بلب، آتا ہے قاتل اس طرف
مُردہ باد، اے آرزوے مرگِ غالب! مُردہ باد



تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشاے حُسنِ دوست
قربانِ اوجِ ریزیِ چشمِ حیا پرست
ہے، دلبری، کمیں گر ایجادِ یک نگاہ

اے طفلِ خود معاملہ! قد سے عصا بلند
مژگانِ باز ماندہ سے، دستِ دعا بلند
یک آسماں ہے مرتبہ پشتِ پا بلند
کارِ بہانہ بُوٹیِ چشمِ حیا بلند



چشمِ بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ
 بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پر رنگ
 بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گلِ تاچند
 شمع و گلِ تاکے و پروانہ و بلبلِ تاچند
 سادگی ہے عدمِ قدرتِ ایجادِ غنا
 ناکسی! آئینہ نازِ توکلِ تاچند
 اسدِ خستہ، گرفتارِ دو عالمِ اوہام
 مشکلِ آساں کن یکِ خلق! تغافلِ تاچند



نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ
 تغافلِ آئینہ دارِ خموشیِ دل ہے
 ہلاکِ بیخبری، نعمتِ وجود و عدم
 جوابِ سنگدلی ہائے دشمنانِ ہمت
 برنگِ نئے ہے نہاں درہراستخواں فریاد
 ہوئی ہے محو، بہ تقریبِ امتحاں فریاد
 جہانِ و اہلِ جہاں سے، جہاں جہاں فریاد
 زدستِ شیشہِ دلہائے دوستاں فریاد
 ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
 خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں! فریاد



رگِ گلِ جادۂ تا رنگہ سے حد موافق ہے
 ملیں گے منزلِ اُلفت میں ہم اور عندلیبِ آخر
 غرورِ ضبط، وقتِ نزع ٹوٹا بیقراری ہے
 نیازِ بالِ افشانی ہوا صبر و شکیبِ آخر
 اسد کی طرح، میری بھی، بغیر از صبحِ رخساراں
 ہوئی شامِ جوانی، اے دلِ حسرتِ نصیب! آخر



ظلم کرنا، گداے عاشق پر نہیں شاہانِ حُسن کا دستور
 دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے دشمنی ہے، وصال کا مذکور
 زندگانی پہ اعتماد، غلط ہے کہاں قصیر؟ اور کہاں فغفور؟
 کیجئے، جوں اشک، اور قطرہ زنی
 اے اسد! ہے ہنوز دلی دُور



اے چرخ! خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات
 لیکن بنائے عہدِ وفا، استوار تر



تیز تر ہوتا ہے خشمِ تندِ خویاں عجز ہے
 ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغِ شعلہٴ خار و خس
 سختی راہِ محبت، منعِ دخلِ غیر ہے
 پیچ و تابِ جاوہ ہے یاں جوہرِ تیغِ عَسَس
 اے اسد! خود ہم اسیر رنگ و بوے باغ ہیں
 ظاہراً صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس



کفر ہے، غیر از و فورِ شوق، رہبرِ خواستن
 راہِ صحراے حرم میں، ہے جرس، ناقوس و بس
 یک جہاں گل، تخیلِ مشقِ شگفتن ہے، اسد!
 غنچہٴ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس



اے آرزو شہیدِ وفا! خوبہا نہ مانگ
 برہم ہے برمِ غنچہ، بہ یک جنبشِ نشاط
 میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں
 نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفسِ دگر
 جز بہر دست و بازوے قاتلِ دعانہ مانگ
 کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل! ہوانہ مانگ
 دشمن سمجھ، ولے نگہ آشنا نہ مانگ
 آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ



بقدرِ حوصلہ عشقِ جلوہ ریزی ہے
بہارِ درِ گروِ غنچہ شہرِ جولاں ہے
طلسمِ خاک، کمیں گاہِ یک جہاں سودا
وگر نہ آئینہ کی فضا معلوم
طلسمِ ناز، بجز تنگیِ قبا معلوم
بمِ رگ، تکمیلِ آسائشِ فنا معلوم
اسد، فریقہٴ انتخابِ طرزِ جفا
وگر نہ دلبریِ وعدہ وفا معلوم



فرطِ بیخوابی سے ہیں شبہائے ہجرِ یار میں
جانتے ہیں، جوشِ سوداے زلفِ یار میں
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
جوں زبانِ شمع، داغِ گرمیِ افسانہ ہم
سُنبُلِ بالیدہ کو موے سرِ دیوانہ ہم
چپکے چپکے جلتے ہیں، جوں شمعِ ماتم خانہ ہم



از آنجا کہ حسرتِ کشِ یار ہیں ہم
تماشاے گلشنِ تمناے چیدن
نہ ذوقِ گریباں، نہ پرواے داماں
رقیبِ تمناے دیدارِ ہیں ہم
بہارِ آفرینا! گنہگارِ ہیں ہم
نگہ آشناے گل و خارِ ہیں ہم
اسد! شکوہ کفر و دعا نا سپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچارِ ہیں ہم

- غالب! ہے رُتبہ فہم تصور سے کچھ پرے
- ہے عجزِ بندگی، جو علیؑ کو خدا کہوں
- میر کے شعر کا احوال کہوں کیا؟ غالب!
- جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں
- جائے کہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں
- دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں
- ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحبِ دولتوں
- ہے زرِ گل بھی، نظر میں جوہرِ فولاد، یاں
- قطرہ ہائے خونِ بسکِ زینبِ دامن ہیں، اسد!
- ہے تماشا کردنی، گلِ چینیِ جلاؤ، یاں
- ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
- قالبِ گل میں ڈھلی ہے نشتِ دیوارِ چمن
- یوسفِ گلِ جلوہ فرما ہے، بہ بازارِ چمن
- وقت ہے، گر بلبلی مسکیں زلیخائی کرے



پھر حلقہ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں
 پایا سر ہر ذرہ، جگر گوشہ وحشت
 دیو و حرم آئینہ تکرارِ تمنا
 جوں دُودِ فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں
 ہیں داغ سے معمور، شقائق کی کلاہیں
 واما ندگی شوق تراشے ہے پناہیں



تمیز زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
 بہ زاہداں رگِ گردن ہے رشتہ زنار
 بہ عکسِ آئینہ یک فردِ سادہ رکھتے ہیں
 سرے پاپے بٹے نا نہادہ رکھتے ہیں



سوداے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں
 دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متصل
 کی متصل ستارہ شماری میں عمرِ صرف
 ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں
 ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
 دیتا ہوں کشتگان کو، سخن سے سر تپش
 ہے جبشِ زباں بدہن، سخت ناگوار
 شامِ خیال زلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
 خمخانہ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں
 تسبیح اشکھائے زمزگاں چکیدہ ہوں
 جوں شانہ پشتِ دست بنداں گزیدہ ہوں
 میں عندلپ گلشنِ نا آفریدہ ہوں
 مضرابِ تا رہاے گلوے بریدہ ہوں
 خونابہ ہلاہلِ حسرتِ چشیدہ ہوں

جوں بوے گل، ہوں گرچہ، گراں بارِ مشیتِ زر

لیکن، اسد! بوقتِ گزشتنِ جریدہ ہوں



نہ انشا معنی مضمون، نہ املا صورتِ موزوں
 عنایت نامہائے اہلِ دنیا ہر زہ عنوان ہیں
 مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
 وگرنہ، مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں
 اسد! بزمِ تماشا میں، تغافلِ پردہ داری ہے
 اگر ڈھانپنے تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عُریاں ہیں



اے نوا سازِ تماشا! سربکف جلتا ہوں میں
 اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں
 ہے تماشا گاہ سوزِ تازہ، ہر یک عضو تن
 جوں چراغانِ دِوالی صفِ بھف جلتا ہوں میں
 شمع ہوں، تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح
 بے محل، اے مجلسِ آراے نجف! جلتا ہوں میں



فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں برنگِ جاوہ، سرکوے یار رکھتے ہیں
 جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب! بسانِ دشتِ دل پر غبار رکھتے ہیں



ہو سکے کب، کلفتِ دل، مانعِ طوفانِ اشک!
 گردِ ساحل، سنگِ راہِ جو شیشِ دریا نہیں
 ہے طلسمِ دہر میں، صد حشرِ پاداشِ عمل
 آگہی، غافل! کہ یکِ امروز بے فردا نہیں
 بسک اس تیغِ دو دستی کا نہیٰ بچا، اسد!
 عافیتِ بیزار! شغلِ کعبتین اچھا نہیں



ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
 عزتِ آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
 کب تلک پھرے اسد لبہائے نقتہ پر زباں
 طاقتِ لبِ تشنگی، اے ساقی کوثر نہیں



زلفِ خیالِ نازک و اظہارِ بیقرار - یارب! بیانِ شانہ کشِ گفتگو نہ ہو



ہم زانوے تامل وہم جلوہ گاہِ گل
 آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ
 دل کار گاہِ فکر و اسدِ بینو اے دل
 یاں سنگِ آستانہ بیدل ہے آئینہ



ہر داغِ تازہ، یکِ دلِ داغِ انتظار ہے
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل
عرضِ فضاے سینہ دردِ امتحاں نہ پوچھ
”دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ“
کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے، کہ آہ



خلق ہے صفحہٴ عبرت سے سبقِ ناخواندہ
میکدے میں زدِ افسردگی بادہ کشاں
ورنہ ہے چرخِ وز میں یکِ ورقِ گرداندہ
موجِ مے، مثلِ خطِ جام ہے برجاماندہ
خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفتہ و بیاں
کہ سخنِ گردِ زدِ امانِ ضمیر افشانده
کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فردِ جہاں میں ورقِ ناخواندہ
حیفِ بیحاصلیِ اہلِ ریا پر، غالب!
یعنی ہیں ماندہ ز آلِ سوڈ ازیں سوراندہ



کی ہے وا اہلِ جہاں نے بگلستانِ جہاں
یاسِ آئینہٴ پیدائی استغنا ہے
چشمِ غفلتِ نظرِ شبنمِ خورِ نادیدہ
ناامیدی ہے پرستارِ دلِ رنجیدہ
واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے، غالب!
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرا میدہ

شکوہ و شکر کو ثمر، بیم و امید کا سمجھ
وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں
گاہ بخلد امید وار، کہ بہ ججیم بیمناک
اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنہ سعی امتحان

خانہ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ
رشتہ عمرِ خضر کو نالہ نارسا سمجھ
گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفتِ ماسوا کچھ
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آن، غفلتِ مدعا سمجھ
جلوہ نہیں ہے دردِ سر آئینہ صندلی نہ کر
ہے خطِ عجزِ ما و تو، اولیٰ درسِ آرزو
شیشہ شکستِ اعتبارِ رنگِ بگردش استوار
نغمہ ہے محو سازِ رہ، نقشہ ہے بے نیازِ رہ
نے سرو برگِ آرزو نے رہ و رسمِ گفتگو

شوق کرے جو سرگراں، محملِ خوابِ پا سمجھ
عکس گجا و گلو نظر، نقش کو مدعا سمجھ
ہے یہ سیاقِ گفتگو، کچھ نہ سمجھ، فنا سمجھ
گرنہ مٹیں یہ کوہسارِ آپ کو تو صدا سمجھ
رند تمام نازِ رہ، خلق کو پار سا سمجھ
اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمہ، یا علی! مدد

ٹوٹے گر آئینہ اسد! سچے کو خوں بہا سمجھ

ہستی فریب نامہ ماجِ سراب ہے یک عمر نازِ شوخی عنوان اٹھائیے



کیا پوچھے ہے بر خرد غلطی ہائے عزیزاں خواری کو بھی اک عار ہے، عالی نسبوں سے
گو تم کو رضا جوئی اغیار ہے، لیکن جانتی ہے ملاقات کب ایسے سبوں سے!
مت پوچھ اسد! وعدہ کم فرصتی زیت
دو دن بھی جو کاٹے، تو قیامت بتوں سے



مجھے معلوم ہے، جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دُوں! وہ بھی



کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بیوفائی!
سر پیٹتے ہیں اپنا؟ ہم اور نیک نامی
ہر چند عمر گزری آزر دگی ہیں، لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ ناتمامی
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گذرے مستوں کی تشنہ کامی



گر مصیبت تھی، تو غربت میں اٹھا لیتے اسد!
میری دہلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری، ہائے ہائے

○ کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو اتنا بھی اے فلک زدہ! کیوں بے حواس ہے؟

○ نظر بہ نقصِ گدایاں، کمالِ بے ادبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریم زیادہ
خوشادہ دل! کہ سراپاِ طلسمِ بیخبری ہو
چمن میں کس کی یہ براہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟
امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
کہ خارِ خشک کو بھی دعوائے چمن نسبی ہے
لبِ قدح پہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے
جنون و یاس و الم، رزقِ مدعا طلبی ہے
کہ برگِ برگِ سمن، شیشہ ریزہ جلی ہے
علیؑ ولیٰ اسد اللہ، جانشینِ نبی ہے

○ بے چشمِ دل، نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

○ تاچند پست فطرتی طبعِ آرزو؟
یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
یارب! ملے بلندی دستِ دعا مجھے
اے جوشِ عشق! بادہٴ مرد آزما مجھے

○
 کہوں کیا گرم جوشی میکشی میں شعلہ رُویاں کی!
 کہ شمع خانہ دل آتشِ مے سے فروزاں کی
 مجھے اپنے جنوں کی بے تکلف پردہ داری تھی
 و لیکن کیا کروں، آوے جو رُسوائی گریباں کی

○
 وہ دیکھ کے حُسن اپنا، مغرور ہوا غالب!
 صد جلوۂ آئینہ یک صُبح جدائی ہے

○
 ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدا!
 لائق نہیں رہے ہیں، غمِ روزگار کے

○
 اسدا! جمعیتِ دل در کنارِ بیخودی خوشتر
 دو عالم آگہی، سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

○
 عاشقِ نقابِ جلوۂ جانا نہ چاہیے
 ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرورِ بخشش
 فانوسِ شمع کو پر پروانہ چاہیے
 پیماں سے ہم گزر گئے پیانہ چاہیے



وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسد!
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے



ہوا شرم تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس اے زخمِ جگر! اب دیکھ لی شورشِ نمکداں کی
بیادِ گرمیِ صحبت، برنگِ شعلہ، دیکھے ہے
چھپاؤں کیونکہ غالب! سوزشیں داغِ نمایاں کی



باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے کر دیا ہے پابہ زنجیرِ رمِ آہو، مجھے



عروجِ نشہ ہے سر تا قدم، قدِ چمنِ رویاں
بجائے خود، وگرنہ، سرد بھی میناے خالی ہے
یہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں، جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے
اسد! اٹھنا قیامتِ قامتوں کا، وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں، بالیدنِ مضمونِ عالی ہے



ہو جہاں، تیرا دماغِ ناز، مستِ بخودی
خوابِ نازِ گلِ رُخاں، دُودِ چراغِ کشتہ ہے



آتشِ افروزیِ یکِ شعلہٗ ایما تجھ سے
اے اسد! دسترسِ وصلِ تمنا معلوم
چشمکِ آریٰ صد شہرِ چراغاں مجھ سے
کاش! ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے



بسکہ ویرانی سے گُفرو دیں ہوئے زیرِ وزیر
اے سرِ شوریدہ! نازِ عشقِ و پاسِ آبرو
گردِ صحراے حرمِ تا کوچہٗ زُتار ہے
یک طرفِ سودا و یک سو منتِ دستار ہے!



بہ سختی ہائے قیدِ زندگی، معلومِ آزادی
شرر در بندِ دامِ رشتہٗ رگہائے خار ہے



بذوقِ شوخیِ اعضآ تکلفِ بارِ بستر ہے
مصافِ پیچ و تابِ کشمکشِ ہر تارِ بستر ہے
مژہ فرشِ رہ و دل ناتوان و آرزو مضطر
پاپے خفتہ، سیرِ وادیِ پُرخارِ بستر ہے

○
 ہو سکے کیا خاک، دست و بازوے فرہاد سے
 بیستوں، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

○
 تر جہیں رکھتی ہے، شرمِ قطرہ سامانی مجھے
 شوق ہے مثلِ حباب از خویش بیروں آمدن
 موجِ گردابِ حیا ہے، چینِ پیشانی مجھے
 ہے گریباں گیرِ فرصتِ ذوقِ عریانی مجھے

○
 شومی طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر
 دردِ ناپیدا و بے جا تہمتِ وارستگی
 نامہٴ اعمال ہے، تاریکی کو کب مجھے
 پردہ دارِ یادگی ہے وسعتِ مشرب مجھے

○
 آسدا! بہارِ تماشاے گلستانِ حیات
 وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

○
 غم و عشرت قدمبوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے
 دعائے مدعا گم کردگانِ عشق ”آئیں“ ہے
 پیامِ تعزیت پیدا ہے، اندازِ عیادت سے
 شبِ ماتم، تہِ دامانِ دُورِ شمعِ بالیں ہے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدا!

دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

عبرت طلب ہے حلِ مغمائے آگہی
خلجبت کش وفا کو، شکایت نہ چاہیے

شبِ نم گدازِ آئینہ اعتبار ہے
اے مدعی! طلسمِ عرق بے غبار ہے

کیا ہے ترکِ دنیا، کاہلی سے
پر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر

ہمیں حاصل نہیں، بے حاصلی سے
رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
پھر ہم در بدر، ناقابلی سے

جنوں افسردہ و باں ناتواں، اے جلوہ! شوخی کر۔
گئی یک عمر خودداری، بہ استقبالِ رعنائی
نگاہِ عبرتِ افسوں، گاہ برق و گاہ مشعل ہے
ہوا ہر خلوت و جلوت سے حاصل، ذوقِ تنہائی

○ رشک ہے، آسائشِ اربابِ غفلت پر آسَد
پیچ و تابِ دل، نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

○ نے حسرتِ تسلی، نہ ذوقِ بیقراری
حضرت چلے حرمِ کوآب آپ کا خدا ہے
بُتخانے میں آسَد بھی بندہ تھا، گاہ گاہ ہے

○ خانمانِ جبریاں غفلت معنی خراب
جب ہوئے ہم بے گناہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟
چاہے گر جنت، جز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخی ایمانِ زاہد، سُستی تدبیر ہے
آب ہو جاتے ہیں، تنگِ ہمتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر، آسَد! گر آہ بے تاثیر ہے

○ یقین ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سببِ کاٹے



خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے
نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زباں سے عرض تمناے خامشی معلوم
وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
زیادہ اُس سے گرفتار ہوں، کہ تو جانے
مگر وہ خانہ برانداز ”گفتگو“ جانے



بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو، غالب! تو پھر
کیوں نہ دلی میں، ہر اک ناچیز نوابی کرے



صبح سے معلوم، آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں! آغازِ کار، آئینہٴ انجام ہے



اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے
تار و پودِ فرشِ محفل، پنبہٴ مینا کرے
توڑ بیٹھے، جب کہ ہم جام و سُبُو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلغام، گو برسا کرے

○
 بہ رہن ضبط ہے، آئینہ بندی گوہر وگر نہ بحر میں ہر قرہ چشمِ پُرَنم ہے
 اگر نہ ہووے رگِ خوابِ صرفِ شیرازہ تمام دفترِ ربطِ مزاج، برہم ہے
 اسد! بہ ناز کی طبعِ آرزو، انصاف
 کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

○
 کشودِ غنچہِ دلہا عجب نہ رکھ، غافل!
 اسد! جہاں کہ علیٰ برسرِ نوازش ہو
 صبا خرامیِ خوباں، بہارِ ساماں ہے
 کشادِ عقدہٴ دشوار، کارِ آساں ہے

○
 دامگاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں!
 پرِ فشانِ بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے
 اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مُشتانی نہ مانگ
 جوں پرِ طاؤس، چندیں داغ، مُشکِ اندودہ ہے
 کیاں کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش!
 عافیت، سرمایہٴ بال و پرِ نکشودہ ہے
 جس طرف سے آئے ہیں، آخر اُدھر ہی جائیں گے
 مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدمِ پیمودہ ہے
 پچبہٴ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں
 سے پرستاں! ناصحِ بیصرفِ گو، بیہودہ ہے



کچھ نہیں حاصل تعلق میں، بغیر از کشمکش
 کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے، اسد
 اے خوشا رندے! کہ مرغِ گلشن تجرید ہے
 یا علی! وقت عنایات و دمِ تائید ہے



شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ و گوپاے ثبات؟
 گل صد شعلہ، بیک جیبِ شکیبائی ہے
 بوے گل، فتنہ بیدار و چمن، جامہ خواب
 وصل بر رنگِ تپش، کسوتِ رسوائی ہے



نوائے خفتہ اُلفت اگر بیتاب ہو جاوے
 پر پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے
 بہ رنگِ گل، اگر شیرازہ بند بیخودی رہے
 ہزار آشفنگی مجموعہ یک خواب ہو جاوے
 اسد! باوصفِ عجز بے تکلف خاک گردیدن
 غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

تاچند، نازِ مسجد و بُتخانہ کھینچے
 چوں شمع، دلِ بخلوتِ جانا نہ کھینچے
 عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
 دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچے
 ہے ذوقِ گر یہ عزمِ سفر کیجئے اسدا!
 رختِ جنونِ سیل بہ دیرانہ کھینچے

دامانِ دل بو ہم تماشا نہ کھینچے
 اے مدّعی! خجالتِ بیجا نہ کھینچے
 گلِ سرسبز، اشارۂ جیبِ دریدہ ہے
 نازِ بہار، جُز بہ تقاضا نہ کھینچے
 حیرت، حجابِ جلوہ و وحشتِ غبارِ راہ
 پائے نظر بد امنِ صحرا نہ کھینچے
 داماندگی، بہانہ و دلبستگی، فریب
 دردِ طلب بہ آبلہٗ پا نہ کھینچے

خود نامہ بن کے جائیے، اُس آشنا کے پاس
 کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچے

جامِ ہر ذرّہ، ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
 کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے
 جوشِ فریاد سے لونگادیتِ خوابِ اسدا!
 شوخیِ نغمہٗ بیدل نے جگایا ہے مجھے



نفس، آئینہ دار آہ بے تاثیر بہتر ہے
نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے
بتاں! نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے

دلِ آگاہ، تسکین خیز بیدردی نہ ہو یارب!
خدایا! چشم تا دل درد ہے، افسونِ آگاہی
دردنِ جوہر آئینہ، جوں برگِ جنا، خوں ہے



ایجادِ گریبانہا، در پردہِ عریانی
عجزِ عرقِ شرے، اے آئینہ! حیرانی
پروازِ فنا مشکل، میں عجز تن آسانی
دامِ گلہِ اُلفت، زنجیرِ پشیمانی
خوں ہو نفسِ دل میں اے ذوقِ پد افشانی!
معدورِ سبکساری، مجبورِ گرانجانی

دریوزہ سامانہا، اے بے سرو سامانی!
تمثالِ تماشاہا، اقبالِ تمنا ہا
دعوائے جنوں باطل، تسلیمِ عبث حاصل
بیگانگیِ خوہا، موجِ رمِ آ ہوہا
پروازِ تپشِ رنگے، گلزارِ ہمہ تنگے
سنگِ آمد و سخت آمد، دردِ سرِ خوداری

گلزارِ تمنا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسدِ بلبل، در بندِ زباندانی



نقدِ صد دل، بگریبانِ سحر پنہاں ہے
آستاں میں صفتِ آئینہ در پنہاں ہے

دو جہاں گردشِ یک سُمہِ اسرارِ نیاز
خلوتِ دل میں نہ کر دخل، بجز سجدہ شوق

نظر پرستی و بیکاری و خود آرائی
 خرابِ نالہ بلبلی، شہیدِ خندہ گل
 ہزار قافلہ آرزو، بیاباں مرگ
 وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا
 رقیبِ آئینہ ہے حیرتِ تماشا
 ہنوز دعویٰ تمکین و نیمِ رسوائی
 ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خودرائی
 اسدا! ہنوز گمانِ غرورِ دانائی

گداے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
 فردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے
 بہارِ حیرتِ نظارہ، سخت جانی سے
 طراوتِ سحرِ ایجادی اثر، یکسو
 چمن چمن گل آئینہ درکنارِ ہوس
 نیاز، پردہ اظہارِ خود پرستی ہے
 بہانہ جوئی رحمت، کمیں گر تقریب
 اسدا! بہ موسمِ گل در طلسمِ گنجِ قفس
 خرامِ تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے
 کہ خامشی کو ہے پیرایہِ بیاں تجھ سے
 چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
 حناے پائے اجلِ خونِ کشتگاں، تجھ سے
 بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
 امیدِ محوِ تماشاے گلستاں تجھ سے
 جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے
 وفاے جوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے



چار سوے عشق میں صاحبِ دکانی مُفت ہے
 نقد ہے داغِ دل اور آتشِ زبانی مُفت ہے
 چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
 بر ہو سہاے جہاں دامنِ فشانِی مُفت ہے



اسد! جاں نذرِ الطائفے، کہ ہنگامِ ہم آغوشی
 زبانِ ہر سر ہو، حالِ دل پر سیدنی جانے



رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے، غالب!
 یاں زورِ خود داری طوفانی معنی ہے



خوبصورت اور معیاری کتاب چھوانے کے لئے شعیب میمن سے رابطہ کیجئے۔

موبائل نمبر: 0300-9231954

خوبصورت اور معیاری کتابیں

کلیاتِ ساحرِ اُدھیانوی



کلیاتِ اقبال



ثناء پبلیکیشنز کراچی

email: sanapublications@hotmail.com

contact: 0300-9231954 - 0300-2529698

Retail Price: 250/-